اقبالیات (اردو)

جنوری تا مارچ، ۱۹۷۶ء

مدیر:

ڈاکٹر محمد معزالدین

اقبال اکادمی پاکستان

عنوان	:	اقبالیات (جنوری تا مارچ، ۱۹۷۶ء)
مدیر	:	محمد معزالدین
پبلشرز	:	اقبال اکادمی پاکستان
شہر	:	کراچی
سال	:	۱۹۷۶ء
درجہ بندی (ڈی۔ڈی۔سی)	:	۱۰۵
درجہ بندی (اقبال اکادمی پاکستان)	:	8U1.66V11
صفحات	:	۸۲
سائز	:	۵ء۲۴×۵ء۱۴س م
آئی۔ایس۔این	:	۰۰۲۱-۰۷۷۳
موضوعات	:	اقبالیات
	:	فلسفہ
	:	تحقیق

مندرجات

جلد: ۱۶ | اقبال ریویو: جنوری تا مارچ، ۱۹۷۶ء | شمارہ: ۴

اقبال ریویو

مجلہ اقبال اکادمی پاکستان

یہ رسالہ اقبال کی زندگی ، شاعری اور فکر پر علمی تحقیق کے لیے وقف ہے اور اس میں علوم و فنون کے ان تمام شعبہ جات کا تنقیدی مطالعہ شائع ہوتا ہے جن سے انھیں دلچسپی تھی ، مثلاً اسلامیات ، فلسفہ ، تاریخ ، عمرانیات ، مذہب ، ادب ، فن ، آثاریات ، وغیرہ ۔

بدل اشتراک

(چار شماروں کے لیے)

پاکستان	بیرونی ممالک
۱۵ روپیہ	۵ ڈالر یا ۱۰۷۵ پونڈ

قیمت فی شمارہ

پاکستان	بیرونی ممالک
۴ روپیہ	۱۰۵۰ ڈالر یا ۰۵۰ پونڈ

مضامین برائے اشاعت

معتمد مجلس ادارت ، ''اقبال ریویو'' ۳۰۰-۶/ڈی ، بلاک نمبر ۶ ، پی ۔ ای ۔ سی ۔ ایچ ۔ سوسائٹی ، کراچی — ۲۹ کے پتہ پر ہر مضمون کی دو کاپیاں ارسال فرمائیں ۔ اکادمی کسی مضمون کی گمشدگی کی کسی طرح بھی ذمہ دار نہ ہوگی ۔

ناشر وطابع: ڈاکٹر ایم معز الدین ، معتمد ، مجلس ادارت و ناظم اقبال اکادمی پاکستان ، کراچی

مطبع : ٹیکنیکل پرنٹرز ، کوچہ حاجی عثمانی ، آئی ۔ آئی ۔ چندریگر روڈ ، کراچی

اقبال ریویو

مجلہ اقبال اکادمی پاکستان

مجلس ادارت

صدر : سید عبدالواحد   معتمد : ڈاکٹر محمد معزالدین

جلد ۱۶   جنوری ۱۹۷۶ء بمطابق ذی الحجہ ۱۳۹۵ھ   نمبر ۴

مندرجات

ہمارے معاونین

- مولانا محمد حسین عرشی — لاہور
- ڈاکٹر محمد ریاض — استاد زبان اُردو و فرہنگ پاکستان دانشگاہ تہران (ایران)
- اختر راہی — واہ (پنڈی)
- ثروت صولت — کراچی
- محمد حمزہ فاروقی — کراچی

مولانا محمد حسین عرشی

اقبال اور ہنگامِ سحر

برون زین گنبدِ در بستہ پیدا کردہ ام راہے
کز اندیشہ بر تر می پرد آہِ سحر گاہے

مذہب یا خدا کے پرستار عموماً تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں :

(۱) وہ جو رسماً یا وراثتاً کسی مذہب کے قائل یا کسی حد تک عامل بھی ہوتے ہیں ۔ وہ اس بحث میں نہیں پڑتے کہ عقل و تجربہ کی میزان میں ان کا یا ان کے عقیدہ و عمل کا کیا وزن ہے ۔ بقول قرآن حکیم

قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ٥ (۵ : ۱۰۴) -

[کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو جس رسم و عمل کا پابند پایا ، وہی ہمارے لیے کافی ہے — اگرچہ ان کے باپ دادا جاہل مطلق اور ہدایت سے یکسر محروم ہی رہے ہوں ۔]

(۲) وہ جو سوچ سمجھ کر کسی عقیدہ و عمل کو قبول کرتے ہیں ۔ وہ باپ دادا کی نقالی نہیں کرتے ۔ بقول غالب

با من میاویز اے پدر! فرزند آزر را نگر
ہر کس کہ شد صاحبِ نظر ، دینِ بزرگان خوش نہ کرد

ایسے لوگ کسی بات کے ردّ و قبول میں دلیل و برہان کی روشنی کے بغیر قدم نہیں اٹھاتے ۔

(۳) وہ جو دلیل و برہان سے گزر کر تجربہ و وجدان اور عرفان و ایقان کی سرحد میں پہنچ جاتے ہیں ۔ ان کا ایمان و یقین ساعی ، تقلیدی بلکہ برہانی سے آگے ، وجدانی و عرفانی ہو جاتا ہے ۔ پیر روم رحمۃ اللہ علیہ نے اس مفہوم کو ایک بلیغ و عمیق شعر میں ادا کیا ہے :

تا لبِ بحر این نشانِ نقش پاست گر بہ بحر آئی نشانِ پا کجاست

یعنی استدلال کی قدر و قیمت رہرو کے نقوشِ قدم کی سی ہے جو پیچھے آنے والوں کو راستہ بتاتے ہیں :

ابھی اس راہ سے گزرا ہے کوئی کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

پھر جب مسافر دریا میں شناوری کرنے لگتا ہے تو نقوشِ پا یعنی دلائل پیچھے رہ جاتے ہیں ۔ اب وہ براہِ راست اپنی منزل سے واصل ہے ۔

ہر وہ شخص جو سوچ سمجھ کر کسی دین کو قبول کرتا ہے ان راہوں سے گزرتا ہوا کبھی بہ نظر تحقیق کفر و الحاد کی وادیوں میں بھی جادہ پیمائی کرتا ہے — جیسا کہ مولانا ابو الکلام نے اپنے حالات میں لکھا ہے :

''گم راہی عمل کی آخری حد فسق ہے اور گم راہی اعتقاد کی اِلحاد — سو فسق و الحاد کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جس سے اپنا نامہ اعمال خالی رہا ہو ۔''

حق گوئی کی کتنی بڑی جراُت ہے !

علامہ اقبالؒ بھی قسام ازل سے سوچنے سمجھنے والا دماغ لے کر آئے تھے ۔ ان سے اللہ تعالیٰ نے یہ کام لینا تھا کہ وہ شکوک و شبہات میں گرفتار ، سوچنے سمجھنے والے دماغوں کی رہنمائی کریں ۔ اپنے تجربات کی روشنی سے ان کی راہوں کی تاریکیاں دور کریں ۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں :

اسی کش مکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

پیچ و تابِ رازی سے مراد وہی دلیل و برہان کی راہ ہے جس میں کوئی گر گیا اور کوئی خوش قسمت منزل تک پہنچ گیا — اور سوز و ساز وجدان و عرفان کا ماحصل ہے ۔ اس شعر میں ''راتیں'' کا لفظ غور طلب ہے ۔ رات کی تنہائی و یکسوئی اس راہ کے سالکوں کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے ۔ اس کے بغیر گرہ کشائی نہیں ہو سکتی ۔ سورۂ مزمّل کا آغاز ''قم الیل'' سے اس پر نصِ صریح ہے ۔

علامہ کے عمیق ذوقِ قرآن اور عشقِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فیضان ہے کہ ان کے کلام کا بیش تر حصہ آغوشِ وحی کا پروردہ معلوم ہوتا ہے ۔ ان کی شب بیداری اور سحر خیزی قرآن حکیم ہی کی تاثیر کا نتیجہ ہے ۔ ہمارے قدیم بزرگ اسی صراطِ مستقیم پر چل کر منزلِ حقیقت تک پہنچے ہیں ۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو ملک نیمروز (سجستان) کے بادشاہ نے اپنے ہاں تشریف لانے اور شاہی مراعات سے بہرہ مند ہونے کی

دعوت دی تو اُنھوں نے جواب میں صرف ایک شعر لکھ دیا :

زانگہ کہ یافتم خبر از ملکِ نیم شب　　من ملکِ نیم روز بیک جو نمی خرم

یہ ملکِ نیم شب یعنی دولتِ شب خیزی ایک عظیم تجرباتی کیفیت و لذت ہے جو حرف و صوت اور تقریر و تحریر کی گرفت میں نہیں آ سکتی :

''ذوق این بادہ ندانی بخدا تا نچشی''

ایک بزرگ فرماتے ہیں :

اللّیل للعاشقین سترٌ　　یا لیت اوقاتہٗ تدومُ

[رات عاشقوں کے لیے خلوتِ وصال ہے - اے کاش ان ساعتوں کو دوام حاصل ہوتا !]

اس موقع پر مولانا جامی یاد آ رہے ہیں :

شب آمد سازگارِ عشق بازان　　شب آمد رازدار عشق بازان
ازان بر روز شان شب اختیارست　　کہ آن یک پردہ در، وین پردہ دارست

[رات آ گئی ، اربابِ عشق کی چہیتی ، رات آ گئی — عاشقوں کی رازدار - یہ لوگ دن پر رات کو اس لیے ترجیح دیتے ہیں کہ پردہ در ہے اور یہ پردہ دار -]

رات ہی کا وقت تھا جب شبانِ وادیٔ ایمن حضرت موسیٰ علیہ السلام روشنی کی تلاش میں نکلے تو یہ واقعہ پیش آیا :

وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا o (۱۹ : ۵۲)-

[اور ہم نے ان کو (کوہ طور کی) داہنی طرف سے آواز دی اور ہم نے انھیں راز و نیاز کی باتیں کرنے کے لیے اپنے قریب بلایا -]

یہی مبارک وقت ہے جس کا ذکر اس مشہور حدیث میں ملتا ہے : ''لی مع اللہ وقت لا یسعنی فیہ ملک مقرب و لا نبی مرسل'' [اللہ تعالیٰ کی معیت میں مجھ پر ایک ایسا وقت بھی آیا ہے جس میں کسی مقرب فرشتے اور نبیِ مرسل کی گنجائش نہیں ہوتی] -

اللہ تعالیٰ اپنے بندے صلی اللہ علیہ وسلم کا محب بھی ہے اور محبوب بھی اور اسی طرح وہ پاک بندہ صلی اللہ علیہ وسلم اس ذات پاک کا محب و محبوب ہے -

قرآن پاک میں شب بیداری و سحر خیزی کے متعلق جو ارشادات وارد ہوئے ہیں - علامہ ان سے بغایت متاثر تھے - ان کی نظر میں تھا کہ : ''اِنَّ ناشئۃ الیل ھی اشد و طأ و اقوم قیلا'' [بے شک رات کا اٹھنا قیام میں مضبوط تر اور

قول میں درست تر ہے] ، یعنی شب بیداری میں قوتِ عملی مضبوط اور بات پُر تاثیر ہوتی ہے - یہی چیزیں ہیں جن کی اصلاحِ خلق کے لیے ضرورت ہے -

علامہ دیکھتے تھے کہ مومنوں کی شان اور ان کے ظاہر و باطن کی تصویر کشی خود خالق جل شانہ' کے قلم اعجاز رقم نے کس حسن و جمال سے کی ہے :

اِنَّمَا یُؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِھَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّھِمْ وَھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ ۝ تَتَجَافٰی جُنُوْبُھُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَھُمْ مِّنْ قُرَّۃِ اَعْیُنٍ جَزَآءً بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ (۳۲ : ۱۵-۱۷) -

[آیاتِ قرآن پر ایمان لانے والوں کی شان یہ ہے کہ جب انہیں ان آیات سے نصیحت کی جاتی ہے تو وہ سجدہ کرتے ہوئے گر جاتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور وہ تکبّر نہیں کرتے - ان کے پہلو بستروں سے الگ ہو جاتے ہیں - ڈرتے ہوئے اور امید رکھتے ہوئے اپنے رب کو پکارتے ہیں اور اس کے دیے ہوئے رزق و مال سے خرچ کرتے ہیں - کوئی شخص نہیں جانتا جو آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے والی نعمتیں ان کے لیے چھپا کر رکھی گئی ہیں اور وہ ان کے اعمال کا بدلہ ہے -]

پیرِ روم اس آیت سے نور حاصل کرتے ہیں :

آن چنان کہ گفت پیغمبر ز نور　　کہ نشانش آن بود اندر صدور
کہ تجافی دارد از دارالغرور　　ہم انابت آرد از دارالسرور

حدیث کا حوالہ دے کر فرماتے ہیں کہ شب خیزی سے سینوں کے اندر ایک نور پیدا ہو جاتا ہے جس کا نشان یہ ہے کہ ایسا شخص دنیوی حرص و ہوا کے فریب میں نہیں آتا - اس سے مستغنی ہو کر آخرت کی دائمی مسرتوں کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے -

بزرگانِ دین میں ایسے بے شمار اصحاب گزرے ہیں جن کی زندگیاں اس نور و استغنا کا زندہ ثبوت تھیں - قرآنِ حکیم ایک اور مقام پر اہلِ تقویٰ کی صفات بیان فرماتا ہے کہ وہ صابر ، صادق ، فرمان بردار ، خدا کی راہ میں خرچ

کرنے والے اور رات کے پچھلے حصے میں توبہ و استغفار کرنے والے ہوتے ہیں :
وَ الْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالاَسْحَارِ ٥ (٣ : ١٧) -

اوپر کے چار مراتب بیان کرنے کے بعد یہ پانچواں مرتبہ ترقی کا آخری مرتبہ ہے ، یعنی صبر و صدق اور قنوت و انفاق کے باوجود اپنے نفس پر بھروسہ نہیں رکھتے ، بلکہ پچھلی رات کی تنہائی میں استغفار کے دامن میں پناہ لیتے ہیں -

حدیث میں وارد ہے کہ جب رات کا تیسرا حصہ باقی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ سماءِ دنیا پر نزول فرماتا ہے اور ارشاد ہوتا ہے کہ

''کیا کوئی سائل ہے کہ میں اس کو عطا کروں ؟''
''کوئی دعا کرنے والا ہے کہ اس کی دعا قبول کروں ؟''
''کوئی استغفار کرنے والا ہے کہ اس کی مغفرت کروں ؟''

اس سے مراد رحمت و فضل کی خاص تجلی ہے جس کے حاصل کرنے کے لیے قلب میں قوتِ جاذبہ ہونی چاہیے -

حضرت خواجہ بہاء الدین نقش بند رحمۃ اللہ علیہ اس کیفیت کو ایک رباعی میں بیان فرماتے ہیں :

شب خیز کہ عاشقان بشب راز کنند گرد در و بام دوست پرواز کنند
ہر جا کہ درے بود بشب بر بندند الا درِ دوست را کہ بشب باز کنند

[رات اہلِ عشق کے لیے راز و نیاز اور قرب و وصال کا وقت ہے - رات کو ہر دروازہ بند ہو جاتا ہے ، لیکن خلوت حبیب کا دروازہ اسی وقت کھلتا ہے -]

خلوت کے لفظ سے نظیری نیشا پوری کا الہامی شعر یاد آ گیا :

آن را کہ برد بخلوت ناز اول درِ زارِش کند باز

رومی فرماتے ہیں :

بے تضرع کام بابی مشکل است کامِ تو موقوف زاریٔ دل است

یہی بات علامہ کے تجربے میں آئی :

عطار ہو رومی ہو ، رازی ہو ، غزالی ہو کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی

سرکار روم ایک اور جگہ دل کھول کر کہتے ہیں :

خواب را بگزار امشب اے پدر ! یک شبے در کوئے بے خواباں گزر
بنگر ایشان را کہ مجنون گشتہ اند ہمچو پروانہ بوصلش کشتہ اند
می دہند ارواح ہر شب زین قفس فارغان از حکم گفتار و قصص
شب ز زندان بے خبر زندانیان شب ز دولت بے خبر سلطانیان
نے غم و اندیشۂ سود و زیان نے خیالِ این فلان و آن فلان

[اے بزرگ! کبھی بستر خواب سے اٹھ کر شب بیدار لوگوں کی خلوتوں میں ان کے ذوق و محویت کا مشاہدہ کرو۔ ان کو دیکھو کہ عشق و جنوں کے غلبے سے پروانوں کی طرح آتش قرب میں کشتہ و سوختہ ہو رہے ہیں۔ ہر رات عالم مادہ اور عناصر کے پنجرے سے ان کی روحیں آزاد ہو جاتی ہیں۔ بات چیت، قصہ کہانی اور امر و حکم سے بالکل فارغ ہو جاتے ہیں۔ رات قیدیوں کو قید خانے سے اور سلاطین کو دولت و حشمت سے بے خبر کر دیتی ہے۔ رات کو سود و زیاں اور من و تو کے اندیشے ختم ہو جاتے ہیں۔]

قرآن پاک نے شب بیداری اور سحر خیزی کے لیے مختلف الفاظ اور بے حد اثر انگیز اسالیب سے کام لیا ہے۔ کہیں فرماتا ہے ''اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْهُوْدًا'' ۝ (۱۷ : ۷۸)۔ ''مشہود'' کی تفسیر کیا ہے۔ اسی آیت سے آگے دو آیتوں کے فاصلے پر خود ہی بیان فرماتے ہیں: ''وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ'' (۱۷ : ۸۲)، یعنی اس وقت خاص میں جاگ کر قرآن حکیم کی تلاوت کرنے سے شفا، رحمت، توفیق اور سکینت قلب آ موجود ہوتی ہیں۔

شیخ الاسلام عبداللہ انصاری رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر ''کشف الاسرار'' میں فرماتے ہیں:

''خنک برآن بندگان کہ بوقت سحر استغفار کنند و شراب مہر بجام عشق وقت سحر نوش کنند۔[1]

''اے محمدؐ! اگر خوش نودی ما می خواہی برود رسالت می گزار و اگر مقام محمود خواہی بشب بیدار باش و نماز کن۔''[2]

آیت فجر ہی کا دوسرا حصہ ہے: وَ مِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ (۱۷ : ۷۹)۔

[اور رات کے خاص حصے میں تہجد پڑھا کرو، یہ تمھاری خاص فضیلت ہے]۔

حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ رات کے آخری حصے میں اللہ تعالیٰ بندے سے نہایت قریب ہوتا ہے۔

۱- ج ۱۵، ص ۶۲۳۔ ۲- ایضاً۔

''بے شک رات میں ایک ایسی ساعت آتی ہے کہ اس وقت بندہ اللہ تعالیٰ سے جو خیر بھی طلب کرتا ہے، وہ عطا فرماتا ہے۔

''ایک اور حدیث میں ہے کہ قیام الیل کو اپنے اُوپر لازم کر لو۔ یہ صالحین کا شیوہ ہے، جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں اور یہ تمہارے لیے قربِ ربانی کا ذریعہ ہے۔ اس سے برائیاں دور اور گناہوں سے بچاؤ حاصل ہوتا ہے۔''[۳]

شیخ الاسلام عبداللہ انصاریؒ اپنی بے نظیر تفسیر میں لکھتے ہیں:

''رابعہ عدویہ رات بھر جاگتیں، دل کی حفاظت کرتیں۔ جب صبح صادق نمودار ہوتی تو یہ اشعار پڑھتی تھیں:

یا نفس قومی فلقد نام الوریٰ	ان تفعلی خیراً فذوالعرش یریٰ
و انتِ یا عین اھجری طیب الکریٰ	عند الصباح یحمد القوم السریٰ

[اے نفس! جاگ جب کہ سب لوگ سو رہے ہیں۔ اس وقت اگر تو کوئی عملِ خیر کرے گا تو یقین کر کہ صاحبِ عرش دیکھ رہا ہے۔ اور اے آنکھ! تو نیند کی لذت کو ترک کر۔ یہی سہانا وقت ہے جب لوگ سفر کرنا پسند کرتے ہیں۔]''

حضرت شیخ الاسلام تہجد سے حاصل ہونے والے مقام محمود کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں ــــ خود انہی کے وجد آور الفاظ پیش کرنے کو جی چاہ رہا ہے:

''و قیل المقام محمود ھو المجالسة فی حال الشھود۔ مقام محمود خاصہ مصطفیٰ است (ص) در خلوت 'او ادنیٰ' بر بساط انبساط، در خیمہ 'ھو معکم' بر سریر اصطفا شراب 'نحن اقرب' بجام قدس نوشیدہ و خلعت وصال پوشیدہ و بدست 'لم یزل' رسیدہ۔''

چار پانچ سطور اور دیکھ لیجیے:

''پیرِ طریقت گفت۔ الٰہی بہر صفت کہ ہستم برخواست تو موقوفم، بہر نام کہ مرا خوانند بہ بندگی، تو معروفم تاجان دارم رخت ازین کوی بر ندارم۔ او کہ تو آنِ اویٔ بہشت او را بندہ است۔ او کہ تو در زندگانی اویٔ جاوید زندہ است۔ الٰہی گفت تو راحت دل است و دیدار تو زندگانی جان، زبان بیاد تو نازد و دل بمہر و جان بعیان۔''[۴]

ان عبارتوں کے ترجمے میں وہ روح تو پیدا ہو ہی نہیں سکتی جو اصل متن میں ہے۔ تاہم کچھ خلاصہ یہ ہے: مقام محمود کی شرح یہ کی گئی ہے کہ وہ

۳- ''حجة اللہ البالغہ''، ج ۲، بیان نوافل۔

۴- ج ۵، ص ۶۲۳ - ۶۲۴۔

ہم نشینی ہے دیدار اور مشاہدہ کی حالت میں ۔ مقامِ محمود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ ہے ، یعنی کوئی دوسری بڑی سے بڑی ہستی اس میں آپ کی شریک نہیں ۔ اس کا تعلق سورۂ نجم کی آیت ''او ادنیٰ'' سے ہے ۔ ''او ادنیٰ'' کی شرح سے یہ بندۂ عاصی جو آپ کے سامنے حاضر ہے ، قاصر ہے اور ساتھ ہی یہ بھی عرض ہے کہ بڑے بڑے مفسروں کو بھی اس مقام پر قاصر ہی پایا ۔ عاجز راقم کی تو کوئی ہستی ہی نہیں ۔ اس موقع پر ایک بزرگ کا یہ واصلانہ شعر یاد آ رہا ہے :

دست ترا گرفتہ بعالم نمود می رشک آیدم و گرنہ نقابت کشود می

آئیے پھر شیخ الاسلام کے مفہوم کی طرف ۔ بتا رہے ہیں کہ مقامِ محمود کیا ہے ۔ یہ خیمہ معیتِ الٰہی میں برگزیدگی کے تخت پر رسائی کا نام ہے ۔ جہاں آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ساغرِ قدس میں بادۂ قرب نوش فرمایا ، خلعتِ وصال زیبِ تن کیا اور ابدی محبوب کی ہم بزمی سے لذت یاب ہوئے ۔

اس کے بعد پیر طریقت کی باری آتی ہے ۔ وہ عرض کرتے ہیں : الٰہی ! میں جس صفت سے بھی موصوف ہوں تیری مشیت کے سہارے قائم ہوں ۔ کسی نام سے بھی مجھے پکارا جائے ، تیری ہی بندگی سے معروف ہوں ۔ جب تک جسم میں جان ہے ، تیرے ہی در پر پڑا رہوں گا ۔ وہ شخص جس کا تو ہو جائے ، بہشت اس کا غلام ہے ۔ جس کی زندگی میں تیری شمولیت ہوئی ، وہ زندۂ جاوید ہو گیا ۔ الٰہی ! تیری بات دل کی راحت ، تیرا دیدار جان کی زندگی ، زبان تیرے ذکر پر نازاں ، دل تیری محبت میں اور جان ملاقات میں سرشار ۔

رومی فرماتے ہیں :

دید آن باشد کہ دیدِ دوست است آدمی دید است باقی پوست است

سکھ دور کے پنجابی شاعرِ عارف ہاشم شاہ یاد آ گئے :

دل تو ہیں ، دلبر بھی توہیں ، میرا وید توہیں دُکھ تیرا
نین پران حیاتی توہیں اک حرف نہیں وچ میرا

اگر اس کا ترجمہ کروں گا تو اس کی جان ہی نکل جائے گی ۔ تاہم جو کچھ ہو سکے حاضر ہے : دل تو ہے ، دل ربا بھی تو ہے ، میرا طبیب تو ہے ، مجھے دُکھ بھی تیرا ہی ہے ۔ آنکھیں اور اعضا ، ہاتھ پیر اور زندگی سب کچھ تو ہی ہے ۔ اس پوری داستان میں ایک حرف بھی میرا نہیں ۔

شیخ الاسلام عبداللہ انصاری ہوں یا پیرِ رومی یا سید ہاشم شاہ — یہ سب ندیاں وحی ربانی ہی کے منبع سے نکلتی ہیں ۔

''قل ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العالمین'' [کہ دیجیے

کہ میری نماز ، عبادات ، زندگی اور موت سب اللہ ہی کی چیزیں ہیں جو تمام کائنات کا پروردگار ہے] ۔

قرب و معیت کی بات چل رہی تھی تو علامہ کے محبوب صاحبِ دل شاعر مرزا بیدل عظیم آبادی کو کیسے فراموش کر سکتا ہوں :

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نرفت رنجِ خمار ما
چہ قیامتی کہ نمی رسی ز کنار ما بکنار ما

اب اس کی شرح نہ پوچھیے ۔ اُوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے اسی پر قیاس کر لیجیے ۔

ایک اور واصل بزرگ نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی ہے :

اتحادیست میانِ من و تو من تو نیست میانِ من و تو

رومی اس مقام پر پہنچ کر آواز دیتے ہیں :

اتصالے بے تکیف ، بے قیاس ہست رب الناس را با جان ناس

اس کے ساتھ اعترافِ عجز بھی کرتے ہیں :

اے برون از وہم قال و قیل من خاک بر فرق من و تمثیل من

حقیقت یہ ہے کہ یہ داستانِ جمیل اتنی طویل ہے کہ بقول قرآن حکیم تمام روئے زمین کے درخت قلم بن جائیں اور ان کے لیے سات سمندر روشنائی کی دوات کا کام دیں ، پھر سات سمندر اور بھی ان میں شامل کر لیں ، تو بات وہاں سے آگے نہیں بڑھے گی جہاں کھڑے ہو کر شیخِ شیراز نے دست بستہ عرض کیا تھا :

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم
و ز ہرچہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بہ پایان رسید عمر
ما ہم چنان در اوّل وصف تو ماندہ ایم

گر کسے وصفِ او ز من پرسد بیدل از بے نشان چہ گوید باز
عاشقانِ کشتگان معشوقند بر نیابد ز کشتگان آواز

علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے کلام سے ان کے ربط و معیت الٰہی سے متعلق اشعار کا انتخاب کیا جائے تو بہت بڑا ذخیرہ حاصل ہو سکتا ہے ۔ اس فرصت میں میں اپنے عنوان کی مناسبت سے ان کے اعمال و اشغال اور کیفیت و سرشاری کے متعلق اپنی تلاش و تحقیق کا خلاصہ پیش کرتا ہوں ۔ اس سے معلوم ہوگا کہ وہ صرف شاعر یا صرف فلسفی یا صرف قانون دان اور سیاست فہم ہی نہ تھے ،

بلکہ اس سے ماوراء بھی بہت کچھ تھے ، اور سچ پوچھیے تو ان کی یہی ماورائیت ان کی شاعری ، ان کے فلسفے اور ان کی فکر و سیاست پر چھائی ہوئی ہے ۔ اس موضوع پر قلم اٹھانے کا حق دراصل کسی ایسے ہی شخص کو پہنچتا ہے جو ان تمام علوم پر حاوی ہو اور اس کے ساتھ ہی صاحب کیف و حال بھی ہو ۔ اور یہ بندہ بلا انکسار کچھ بھی نہیں ۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ :

پائے ملخے پیش سلیماں بُردن عیب است و لیکن ہنر است از مورے

میرے معروضات مربوط و منتظم نہ ہوں تو ان کے لیے پہلے سے ہی علامہ کے الفاظ میں معذرت طلب کرتا ہوں :

عجب نہیں کہ پریشاں ہے گفتگو میری
فروغ صبح پریشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

سحر کا وقت شب و روز کے تمام اوقات میں منتخب اور اپنی بعض خصوصیتوں کی وجہ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ یہی وقت ہے جب کتابِ ہستی کا ایک ورق ختم ہونے اور دوسرے کے آغاز کی تیاری ہوتی ہے ۔

علامہ فرماتے ہیں :

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

علامہ عمر بھر اس اذانِ سحر کے منتظر رہے جو گوشِ عالم نے صرف ایک مرتبہ چھٹی صدی عیسوی میں عرب کے ریگ زاروں میں سنی ۔ اس کے بعد یہ زمین اس آواز کو ترس گئی اور علامہ کی زبان سے فریادی ہوئی :

قلب و نظر پر گراں ایسے جہاں کا ثبات
کیوں نہیں ہوتی سحر حضرت انساں کی رات ؟

علامہ وقتِ سحر کے لمحہ قبولیت کے عاشق تھے ۔ وہ جہاں بھی ہوتے ، سفر ہو یا حضر ، اس کی جدائی گوارا نہیں کرتے تھے ۔ وہ برق و بخارات کا ملک جہاں سے ہمارے نونہال فسق و الحاد کی سوغات لے کر آتے ہیں ، علامہ وہاں بھی اسی محبوبہ کی آغوش میں تسکین حاصل کرتے ہیں :

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی

یہ گرم گرم لحافوں میں غفلت کی نیند میں سونے کا وقت اور یہ رغبت الی اللہ ''تتجافیٰ جنوبہم عن المضاجع'' کی عملی تفسیر ہے ۔ یہی وقت ہے جب باہر کے دروازے بند ہوتے ہیں اور اندر کے دوازے کھلتے ہیں ۔ رقّت و گداز

کے ساغر لنڈھائے جاتے ہیں :

سحر در شاخسار بوستانی چہ خوش می گفت مرغ نغمہ خوانی
بر آور ہرچہ اندر سینہ داری سرودی ، نالۂ ، آہی ، فغانی

اس ساعتِ حسین و جمیل کی نزاکت آج تک کسی بھی شاعر کے خیال میں کہاں آئی ہوگی ۔ آئیے علامہ کی فکر نکتہ رس سے سنیں :

مانند سحر صحن گلستاں میں قدم رکھ آئے تہِ پا گوہر شبنم تو نہ ٹوٹے

سبحان اللہ ! کیا ''آہستہ خرام بلکہ مخرام'' کا منظر ہے !

وہ اس عصر بے روح کو اپنی سحر کے پیغام سے زندہ کرنا چاہتے تھے ، یعنی وہ فیضانِ سحر کو اپنی ذات تک محدود رکھنے کے قائل نہیں تھے ۔ چنانچہ اس دور کی بے جان مذہبی قیادت کو مخاطب فرماتے ہیں :

تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال
تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

''گلشن راز جدید'' میں قدیم و حادث کے متعلق فلسفہ آمیز تصوّف کے انداز میں محب و محبوب کی جدائی کی حکمت بیان فرماتے ہیں :

فراق او چنان صاحب نظر کرد کہ شام خویش را بر خود سحر کرد

یعنی اگر انسان وصال کی لذت میں مست و سرشار اور محو و غرق ہو جاتا تو یہ سعی و جہد ، یہ محنت و کاوش جو بے شمار ظلمتوں کو چیرتی ہوئی بے شمار صبحوں کو نمودار کرتی جاتی ہے ، ظہور میں نہ آتی ۔ انسان اوّل کو دیکھیے اور آج کے انسان کی ایجادات و اکتشافات پر نظر ڈالیے اور پھر آئندہ زمانوں کی رفتارِ ارتقا کا اندازہ لگائیے ۔ ان تمام کائناتی تغیرات کو جو انسان کے ہاتھوں رونما ہو رہے ہیں ، صرف ایک شام و سحر میں شاعرِ عارف نے سمیٹ لیا ہے :

کہ شام خویش را بر خود سحر کرد

خواجہ حافظ بھی قرآن حکیم کی رہبری میں صبح سے کسبِ فیض کرتے ہیں ، لیکن صرف اپنی ذات کے لیے :

صبح خیزی و سلامت طلبی چون حافظ ہرچہ کردم ہمہ از دولتِ قرآن کردم

علامہ بھی قرآن ہی کی خلوت میں گوشہ گیر ہوتے ہیں اور وہاں سے جو کچھ حاصل کرتے ہیں اس کو پوری امت میں تقسیم کر دیتے ہیں :

ازان نورے کہ از قرآن گرفتم سحر کردم صد و سی سالہ شب را

غلامی کی طویل رات جو مسلم حکومت کے انتزاع سے قوم پر محیط ہو گئی

تھی ، اس کو صبح کی روشنی میں تبدیل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے صحیفۂ نور قرآن حکیم سے نور حاصل کرتے ہیں ۔

محض مادیت کی ترقی انسان کے لیے — جو محض مادہ نہیں بلکہ روح بھی ہے — کافی نہیں ۔ اس سے اُس کی مشکلیں حل نہ ہوں گی ۔ اس کی تاریک رات میں سحر کا نورانی چہرہ نظر نہیں آئے گا ۔ آہ یہ بزعم خود ترقی یافتہ انسان !

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

حضرت علامہ مادی ترقی کے خلاف نہیں ہیں ، لیکن اسی پر قناعت کر لینا اور زندگی کے دوسرے زیادہ اہم اور جاودانی پہلو سے بے نیاز رہنا محض شب پرستی اور سحر دشمنی ہوگی :

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر !
فطرت کا تقاضا ہے کہ ہر شب کی سحر کر

ہر شب کے بعد سحر کا نمودار ہونا فطرت کا ایسا تقاضا ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ۔ یہ ہو کر رہتا ہے اور ہو کر رہے گا ۔ اس کے بغیر انسان اپنے فطری نصب العین سے ہم کنار نہیں ہو سکتا ۔

علامہ خواص و عوام کو عموماً اور خاص خاص گروہوں کو خصوصاً جھنجھوڑتے ہیں ۔ رات کی ظلمت سے نکال کر سحر کی روشنی کی طرف دعوت دیتے ہیں ۔ وہ خود پنجاب کے باشندے تھے ۔ اپنے قرب و جوار میں دہقانوں کی اکثریت کے غیر مختتم جمود کو دیکھتے تھے ، ایسا جمود جس میں گرفتار لوگ خود بھی اپنے جمود سے آگاہ نہیں تھے اور اپنی خاک بازی پر قطعی طور پر قانع ہو چکے تھے ۔ علامہ ایک مختصر نظم میں اس طبقے کو جامع پیغام دیتے ہیں ۔ اس کے دو شعر سن لیجیے :

بتا کیا تری زندگی کا ہے راز ہزاروں برس سے ہے تو خاک باز
اسی خاک میں دب گئی تیری آگ سحر کی اذاں ہو گئی اب تو جاگ

مسلمان کو جگانے کے لیے صرف سحر کافی نہیں ، اذانِ سحر کی بھی ضرورت ہے ۔ اس نکتے پر علامہ کے سوا کس کی نگاہ پہنچ سکتی تھی ؟

فرزندِ صحرا کو ترکِ تعود و جمود اور ترغیبِ قیام و خرام دیتے ہوئے سحر ہی کی طرف متوجہ فرماتے ہیں :

سحر گاہاں کہ روشن شد در و دشت صدا زد مرغے از شاخِ نخیلے
فروہل خیمہ اے فرزندِ صحرا ! کہ نتوان زیست بے ذوق رحیلے

لاہور کی سابق میو روڈ (اور اب اقبال روڈ) کی جاوید منزل میں نہیں، کسی لق و دق صحرا میں کوئی دردمند تنہا پکار رہا ہے۔ صبح پھوٹ رہی ہے۔ کھجور کے صرف دو ایک درخت اور دو ایک خیمے اور بس ـــ یہ منظر کتنا دل کش و دل کشا ہے، جو اس قطعے میں پیش کیا گیا ہے۔

شاعرِ عارف اپنی حیات افروز دعوت کے لیے یہی مبارک وقت انتخاب کرتے ہیں اور اس سے معجزانہ توقع رکھتے ہیں:

کیا عجب میری نواہائے سحر گاہی سے
زندہ ہو جائے وہ آتش جو تری خاک میں ہے

ان کے سینے میں ایک دردِ لازوال ہے جو لمحہ بہ لمحہ کئی روپ اختیار کرتا ہے:

کبھی حیرت، کبھی مستی، کبھی آہِ سحر گاہی
بدلتا ہے ہزاروں رنگ میرا دردِ مہجوری

یہ مہجوری کیا ہے؟ اس عظمت و شوکت سے مہجوری جو اسلام نے بادیہ نشینوں کو بخشی۔ پھر جہاں جہاں اسلام کے نام لیوا گئے وہی شانِ جلال و جمال ان کے ہم رکاب رہی۔ اس تشریح کی تائید اسی نظم کا دوسرا شعر کر رہا ہے:

کوئی تقدیر کی منطق سمجھ سکتا نہیں ورنہ
نہ تھے ترکانِ عثمانی سے کم ترکانِ تیموری

حکیم سنائی غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا تھا:

مردگی جہل و زندگی دین است ہرچہ گفتند مغز آن این است

قرآن حکیم نے بھی بار بار غیر دینی زندگی کو موت سے تعبیر کیا ہے۔ اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی (۲۷ : ۸۰) [تو مُردوں کو نہیں سنا سکتا یعنی ان لوگوں کو جو عقل و شعور سے کام نہیں لیتے] وَمَا یَسْتَوِی الْاَحْیَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یُسْمِعُ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِی الْقُبُوْرِ (۳۵ : ۲۲)۔ [زندے اور مُردے برابر نہیں ہو سکتے۔ خدا جسے چاہتا ہے سنا (سمجھا) دیتا ہے اور (اے رسول!) جو قبروں میں ہیں انہیں تم نہیں سنا (سمجھا) سکتے]۔ یہاں علما نے مُردوں اور قبر والوں سے مراد کفار لیے ہیں اور زندوں سے مراد اہلِ ایمان۔ جیسا کہ اس آیت میں ہے۔ اِنْ ھُوَ اِلَّا ذِکْرٌ وَّ قُرْاٰنٌ مُّبِیْنٌ لِّیُنْذِرَ

مَنْ کَانَ حَیاً وَّ یُحِقَّ الْقَوْلُ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ ۝ (۳۶ : ۶۹-۷۰) [یہ کتاب تو نصیحت اور صاف صاف قرآن ہے تاکہ جو زندہ ہو تو اُسے عذاب سے ڈرائے اور کافروں پر عذاب کا قول ثابت ہو جائے] ۔ یہاں زندہ اس کو کہا گیا جو قرآن حکیم سے متاثر ہوتا ہے ۔ اس کے مقابلے میں انکار کرنے والے کو کافر فرمایا ہے ۔

مسلمان کے لیے دین ہی دنیوی خوش حالیوں اور اُخروی نعمتوں کا وسیلہ ہے ۔ اس کے بغیر ظلمت ہی ظلمت ہے ، جس میں روشنی کی کوئی کرن نہیں ، جس کے خاتمے کی کوئی اُمید نہیں :

شبے کہ گورِ غریبان نشیمن است او را مہ و ستارہ ندارد چسان سحر گردد

نئی روشنی جس سے ظاہر ہیں آنکھیں ایسی چندھیا گئیں کہ ابدی حقائق ان سے اوجھل ہوگئے ۔ در و بام اور کوچہ و بازار تو چمک اٹھے لیکن انسانیت کا اندروں نورِ سحر سے محروم ، تاریک راتوں کا لامتناہی تسلسل بن گیا !

تجلیٔ کہ بر و بوم دیر می نازد ہزار شب دید و تاب یک سحر ندہد

''زبورِ عجم'' کا بیشتر حصہ عابد و معبود یا طالب و مطلوب کے مکالمات پر مشتمل ہے ۔ اس میں بہت سی باتیں آ گئی ہیں جو شرح و ترجمہ کی متحمل نہیں ہو سکتیں ۔ ان کا تعلق باطنی احساس اور روحانی تجربات سے ہے :

پُرسید یکے کہ عاشقی چیست ؟ گفتم کہ چو ما شوی بدانی !

جس نے کبھی عشق و فراق کی بے تابیوں کا مزا چکھا ہی نہیں ، اس کو اس کی حقیقت سمجھانے کے لیے الفاظ کہاں سے لائے جائیں ۔ بقول میر تقی :

گزری ہے جن کی عمر محبت کیے بغیر وہ بدنصیب مر گئے گویا جیے بغیر

ایسے ہی ایک مقام سے علامہ کی یہ آواز آ رہی ہے :

شب من سحر نمودی کہ بہ طلعت آفتابی
تو بطلعت آفتابی سزد این کہ بے حجابی

آفتاب کے سوا کون ہے جو شب کو سحر بنائے اور آفتاب کے چہرے پر کون برقع ڈال سکتا ہے ؟ یہاں بے ساختہ قرۃ العین طاہرہ یاد آ گئی :

سحر آن نگارستم گرم قدمے نہاد بہ بسترم
فاذا رایت جمالہٗ طلع الصباح کانما

علامہ کی لاہوتی نوا سے اگرچہ اس نغمۂ ناسوتی کو کوئی نسبت نہیں ، لیکن سحر و صباح کی مناسبت سے یہ بھی سامنے آ گیا ۔

آخری عمر میں جب مختلف عوارض نے ان کے جسم کا محاصرہ کر رکھا

تھا ، ذہنی احساس اور فکری توانائی میں پہلے سے بھی زیادہ برنائی و براق پیدا ہوگئی تھی ۔ چنانچہ ''ارمغانِ حجاز'' میں ''حضور رسالت'' کے عنوان سے جو قطعات لکھے گئے ہیں وہ اس کی شہادت کے لیے کافی ہیں ۔ ایک قطعہ میں فرماتے ہیں :

شب ہندی غلامان را سحر نیست باین خاک آفتابے را گزر نیست
بما کن گوشہ چشمے کہ در شرق مسلمانے ز ما بے چارہ تر نیست

ہندی غلاموں کی رات کو صبح بنانے کے لیے جس آفتاب کی ضرورت تھی ، وہ گوشہ چشم مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سوا کون ہو سکتا ہے ؟ کیونکہ :

''بمصطفیٰ برسان خویش را کہ این ہمہ اوست''

آج بھی ہماری بے شمار مشکلات کا حل یہی ہے ۔

علامہ نے اپنی شاعری کا آغاز ''بانگِ درا'' سے کیا ۔ ''بانگ درا'' کیا ہے ؟ خواب کو بے داری کا ، سکون کو حرکت کا ، قعود کو قیام اور پھر تیز قدم چل پڑنے کا پیغام و اعلان ۔ انھوں نے شروع ہی سے اپنی شاعری کا مقصد متعین کر لیا تھا کہ قوم کو میٹھی لوریاں دے کر سلانا نہیں بلکہ اس قافلے کو اٹھا کر اپنی منزل کی طرف رواں دواں کرنا ہے ، جیسا کہ انھوں نے کہا :

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

یہی فریضہ وہ عمر بھر انجام دیتے رہے جیسا کہ فرماتے ہیں :

صبح دمیدد کاروان کرد نماز و رخت بست
تو نشنیدۂ مگر زمزمۂ درائے را

ان کی صبح نماز سے شروع ہوتی ہے ۔ ان کا قافلہ روانگی سے پہلے نماز ادا کرتا ہے ۔ وہ تنہا روی کے قائل نہیں ، بلکہ ایک کارواں کی صورت میں ایک نقطۂ نگاہ اور ایک متفقہ منزل کی طرف دعوت دے رہے ہیں ۔

کبھی وہ امتِ مسلمہ کی گزشتہ پرجلال صبحوں کو حال بنا کر سامنے لے آتے ہیں ، تاکہ قوم اپنے ماضی کا عرفان حاصل کرکے مستقبل کو تابناک بنائے ۔ چنانچہ سلطان محمود غزنوی کے مزار پر پہنچ کر ، اپنے ماحول سے الگ ہو کر ، اُس دورِ قدیم کا چشمِ تصور سے مشاہدہ کرتے ہیں :

وارہیدم از جہان چشم و گوش فاش چون امروز دیدم صبح دوش

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ ان کا جسم لاہور میں اور روح حجاز میں نغمے

بکھیرتی رہتی تھی :

عجمی خم ہے تو کیا مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا لَے تو حجازی ہے مری

''نغمہ ساربان حجاز'' یعنی ''حدی'' کے عنوان سے ایک نہایت دل کش اور مترنم نظم میں جا بجا صبح کی تجلیاں بکھیرتے چلے جاتے ہیں ۔ ساربان اپنی ناقہ سیّار و تیز رفتار سے کہہ رہا ہے :

سوز تو اندر زمام — ساز تو اندر خرام — بے خورش و تشنہ کام
پا بہ سفر صبح و شام — خستہ شوی از مقام — تیز ترک گام زن
منزلِ ما دور نیست

شام تو اندر یمن — صبح تو اندر قرن — ریگ درشت وطن
پائے ترا یاسمن — اے جو غزال ختن — تیز ترک گام زن
مہ ز سفر پا کشید — در پس تل آرمید — صبح ز مشرق دمید
جامہ شب بر درید — باد بیابان وزید — تیز ترک گام زن
منزلِ ما دور نیست

اقوامِ سرحد کو خطاب کرتے ہوئے سچے مسلمان کے اوصاف بیان فرماتے ہیں ۔ اس طویل نظم کے ایک شعر میں مسلمان کی صبح کا ذکر آ گیا ہے :

صبحش از بانگے کہ بر خیزد ز جان — نے ز نور آفتاب خاوران

اس کی صبح آفتاب مشرق کی روشنی کا انتظار نہیں کرتی بلکہ اس کے اندر سے اللہ اکبر کی آواز اس کو صبح خیزی کا پیغام دیتی ہے ، یعنی دینی امر و نہی اس کی سرشت بن جاتے ہیں ۔ اسے ان کی تعمیل میں کوئی تکلف محسوس نہیں ہوتا ۔

ویرانۂ غزنین میں ایک مردِ شوریدہ کی مناجات میں عہدِ حاضر کے مسلمان کی نا مسلمانی کا مرثیہ لکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کی نشاۃ ثانیہ کی التجا کی گئی ہے :

بازجذب اندرون او را بدہ — آن جنونِ ذو فنون او را بدہ
شرق را کن از وجودش استوار — صبح فردا از گریبانش بر آر

علامہ امید رکھتے ہیں کہ صبح فردا یعنی مستقبل کی روشنی اسلام اور اسلامی احکام ہی کی تعمیل پر منحصر ہے ۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ آبادی کے اضافہ در اضافہ سے چھوٹی بستیاں بڑے بڑے شہروں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں ۔ اسی نسبت سے جرائم و حوادث میں

بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے ۔ دیانت و امانت اور شرافت و اخلاق قصۂ پارینہ بن جاتے ہیں ۔ مدعیانِ اصلاح ذاتی اصلاح سے بے نیاز اور کرسی نشینانِ عدل ظلم کی سوداگری سے نفع اندوز ہوتے ہیں ۔ ایسے حالات میں کوئی مردِ صحرائی نمودار ہوتا ہے اور آوازۂ حق بلند کرتا ہے :

اے شیخ بہت اچھی کالج کی فضا لیکن
بنتی ہے بیاباں میں فاروقی و سلمانی

ایسی تاریک راتوں کا خاتمہ کرنے والی صبح شہروں سے نہیں کوہ و صحرا سے جلوہ گر ہوتی ہے :

دراں شب ہا خروش صبح فرداست
کہ روشن از تجلی ہائے سینا ست

تن و جان محکم از بادِ در و دشت
طلوع امتان از کوہ و صحرا ست

''ارمغانِ حجاز'' کے دور میں ان پر ایسا وقت بھی آیا کہ وہ موجودہ مسلمان کی بے راہروی سے مایوس ہو کر ایک دوسری امت کی آرزو کرتے جو اسلام کی حقیقت کو سمجھے اور اس پر عمل پیرا ہو ۔ ان کے دل سے آواز اٹھی :

بیا نقش دگر ملّت بریزم
کہ این ملّت جہان را بار دوش است

یہ ملّت تو دنیا کے لیے بار دوش بن گئی ہے ۔ اس کی جگہ نئی ملّت اور نئی قوم ہونی چاہیے :

دگر قومے کہ ذکر لا الٰہش
برآرد از دل شب صبح گاہش

ایک ایسی قوم جس کا ذکر لا الہ الا اللہ یعنی اتباع قانونِ خداوندی سیاہ کاریوں کی رات کا تابندہ کردار کی صبح سے خاتمہ کر دے ۔

یہی زمانہ تھا جب ہندو کانگرس انگریز سے برسرپیکار تھی اور مسلمان آپس میں گتھم گتھا ہو رہے تھے ۔ احرار ، خاکسار ، نیلی پوش ، مسلم لیگی اور کانگرسی مسلمان ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتے ، تہمت طرازیاں ، الزام تراشیاں اور شخصی حملوں تک سے گریز نہیں کرتے تھے ۔ ایک دوسرے کے جلسوں کو خراب کرتے تھے ۔ اختلاف ہندوؤں میں بھی تھا ، لیکن گاندھی ، پنڈت مالوی ، ٹیگور ، سپرو وغیرہ مختلف مسالک کے باوجود ایک دوسرے کا احترام کرتے بلکہ اپنی اپنی حدود میں رہ کر تعاون میں بھی تامل نہیں کرتے تھے ۔ کسی کے خلاف کوئی نازیبا کلمہ زبان و قلم سے نہیں نکالتے تھے ۔ لیکن صاحبِ خلقِ عظیم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا ایک دوسرے کے جانی دشمن بنے ہوئے تھے ۔ قائدِ اعظم پر قاتلانہ حملہ اپنی ہی قوم کے ذہن کی ترجمانی کر رہا تھا ۔ علامہ ایسے حالات دیکھتے اور کڑھتے تھے ۔ ایک دن میں نے عرض کیا کہ ''ان مختلف جماعتوں کے لیڈروں کو اپنے ہاں بلائیے اور سمجھائیے کہ یہ تم نے

کیا تماشا بنا رکھا ہے ؟ خدا را اس جنگ آرائی کو چھوڑ کر اجتماعی مفاد کے لیے متحد ہو جائیے ۔'' میری عرض کے جواب میں آپ نے فرمایا : ''ایسی میٹنگ شیخ صادق حسن (صدر ، مسلم لیگ ، امرتسر) کے ہاں ہونی چاہیے ۔'' میں نے عرض کیا : ''شیخ صادق حسن کا کیا اثر ہے ؟ وہ اس اہم خدمت کو انجام نہیں دے سکتے ۔'' مکرر فرمایا : ''میرے پاس پیسے نہیں ہیں ۔''

اس مختصر اور بلیغ جواب کی تشریح کرنا اس صحبت میں مناسب نہیں ۔ ہر شخص اپنے اپنے فہم کے مطابق اس کا مطلب نکال سکتا ہے ۔

اس سے کچھ عرصہ پہلے وہ دور بھی گزر چکا تھا جب سلطان عبدالعزیز ابن سعود والیٔ حجاز بنا اور اس نے قبّہ شکنی کی سہم سے عموماً عالمِ اسلام میں اور خصوصاً برصغیر میں ایک عظیم ہنگامہ برپا کر دیا ۔ حنفی ، وہابی ، شیعہ ، سُنّی ، اہلِ حدیث وغیرہ میں سخت کش مکش شروع ہو گئی ۔ مسلمان سلطان کے موافق و مخالف کی صورت میں دو متحارب گروہ بن گئے ۔ یہ خانہ جنگیاں عہدِ غلامی کو طول دینے والی ثابت ہو سکتی تھیں ۔ اسی دور میں علامہ کے دلِ دردمند سے یہ آواز اٹھی تھی :

اگر قبول کرے دینِ مصطفٰی انگریز سیاہ بخت مسلماں رہے گا پھر بھی غلام

لسان العصر اکبر الہ آبادی کی چیخ بھی سن لیجیے :

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر مجھے تو اُن کی بہبودی سے ہے یاس

اور حالی کا مسدس تو نرا مرثیہ ہی مرثیہ ہے ۔

اسی پس منظر اور انھی اسباب و وجوہ نے اس قسم کے اشعار کہلوائے :

بیا نقش دگر ملّت بریزیم کہ این ملّت جہان را بار دوش است

ان کی فکر برِصغیر میں محدود نہیں تھی ۔ وہ پورے عالمِ اسلام پر نظریں جمائے ہوئے تھے ۔ عرب ، ترکیہ ، ایران ، افغانستان وغیرہ سب کو احیا و اعتلا کا پیغام ان کے کلام میں ملتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے خیالات کا زیادہ کھل کر فارسی زبان میں اظہار کیا ہے ۔ چنانچہ اس دور کے افغان حکمران کو قرآن حکیم کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

صد جہاں باقیست در قرآن ہنوز اندر آیاتش یکے خود را بسوز
باز افغان را ازان سوزے بدہ عصر اُو را صبح نو روزے بدہ

اس موقع پر ایک تجربے کی بات عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں ۔ جب آپ کسی مصنف کا متن دیکھ رہے ہوتے ہیں تو براہِ راست آپ کے سامنے مصنف موجود ہوتا ہے ۔ لیکن جب اس کے شارح کی نکتہ آفرینیوں کا مطالعہ کرتے ہیں

تو وہ اوجھل ہو جاتا اور شارح سامنے آ جاتا ہے ۔ مثلاً قرآن حکیم کی تلاوت کے وقت ایک صاحبِ خشوع و خضوع مسلمان اپنے آپ کو اللہ کے حضور میں تصور کرتا ہے ۔ وہ اپنے محبوب و مطلوب ، خالق و مالک سے شرفِ مکالمہ حاصل کر رہا ہوتا ہے ۔ لیکن جب وہ رازی و زمخشری کی ورق گردانی کرتا ہے تو اس بارگہ بلند سے اُتر کر ان بزرگوں کی مجلس میں آ جاتا ہے ۔

میں نے اس مقالے کی تیاری میں کسی فاضل شارح سے استفادہ حاصل نہیں کیا ۔ براہِ راست علامہ کی خدمت میں حاضر رہا اور میرے محدود علم و فہم نے جو کچھ اخذ کیا اس کو سپردِ قلم کر دیا ۔ بعض مقامات پر ان کی پروازِ فکر میری رسائی سے بہت بلند معلوم ہوئی ۔ ایسے موقع پر ممکن ہے کہ میں ان کے حقیقی مقصد تک نہ پہنچ سکا ہوں ۔ یہ ایک ایسی صحبت ہے جس میں یقیناً مجھ سے بہتر اقبال فہم ، اہلِ علم موجود ہیں ۔ ان سے معذرت اور اعترافِ عجز کے ساتھ ایک ایسے ہی نازک مقام کی طرف اشارہ کرنے کی جسارت کرتا ہوں ۔

مثنوی "پس چہ باید کرد" میں ''روحِ مومن'' کی حقیقت بیان فرماتے ہیں ۔ روح کسی کی بھی ہو اس کا بیان آسان نہیں ، پھر روحِ مومن تو اور زیادہ عمق اور اہمیت کی حامل ہوتی ہے ۔ شاید ایسے ہی موقعوں پر عارفِ پنجاب حضرت سلطان باہو نے فرمایا ہے : ''دل دریا سمندروں ڈونگھا کون دلاں دیاں جانے'' [دل ایک دریا ہے جو سمندر سے بھی زیادہ عمیق ہے ۔ اس کے عمق تک کس کی رسائی ہو سکتی ہے ؟] ۔ علامہ فرماتے ہیں :

سِرِّ حق بر مردِ حق پوشیدہ نیست　　روحِ مومن ہیچ می دانی کہ چیست ؟

مردانِ خدا پر اسرارِ خدائی کھول دیے جاتے ہیں ۔ مومن کی روح جس پر ان اسرار کا انکشاف ہوتا ہے ، تم سمجھتے ہو کہ اس کی حقیقت کیا ہے ؟ یہ ایک سوال ہے ۔ اس کا جواب یہ ہے :

قطرۂ شبنم کہ از ذوقِ نمود　　عقدۂ خود را بدست خود کشود

افہام و تفہیم میں تشبیہ و تمثیل کے بغیر چارہ نہیں :

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفت و گو
''بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر''

روحِ مومن کو اس قطرۂ شبنم کی طرح سمجھو جس نے اپنے ذوقِ نمود سے اپنی گرہ خود ہی کھول ڈالی :

از خودی اندر ضمیرِ خود نشست　　رخت خویش از خلوت افلاک بست

اسی ذوقِ نمود کا دوسرا نام خودی یا انا ہے جس سے وہ اپنی ضمیر تک پہنچتا ہے ، یعنی خود شناسی ، یا اپنا عرفان حاصل کرتا ہے ۔ اس کا اصلی مقام خلوتِ افلاک تھا ۔ وہاں سے وہ قطرہ سفر کرتا ہوا نیچے اترتا ہے ، لیکن وہ اپنی قطرگی یا انفرادیت کو قائم رکھتا ہے ، اپنے آپ کو بحرِ بےکنار میں سپردِ صدف نہیں کر دیتا :

رخ سوئے دریائے بے پایاں نکرد خویشتن را در صدف پنہاں نکرد

وہ صبح کی آغوش میں دم بھر کے لیے تڑپتا ہے اور غنچۂ نودمیدہ کے حلق میں ٹپک پڑتا ہے ۔ شاید اس کا یہ مطلب ہے کہ مومن کی روح اپنے اضطراب و قلق کے لیے ہنگامِ صبح کو انتخاب کرتی ہے ۔ یہی وقت ہے جب اس کے باطن کی کلی شگفتہ ہوتی ہے اور پھر اس کی خوشبوئیں فضا کے عالم میں پھیلتی ہیں :

''یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا''

واللہ اعلم بالصواب

یہ تو تھا روحِ مومن کا عروج و نزول اور تمکین و تاثیر ۔ اب آئیے اس طرف جہاں ایمان کے خورشیدِ ظلمت ربا کی کوئی کرن نہیں پہنچتی ۔ صبح تو وہاں بھی ہوتی ہے لیکن کیسی ؟ اسی مثنوی میں ''حکمتِ فرعونی'' کے عنوان سے اس مفہوم کی مکمل تشریح فرماتے ہیں :

حکمتِ اربابِ دیں کردم عیاں حکمتِ اربابِ کیں را ہم بداں

یہ اربابِ کیں یعنی ایمان سے محروم قوم کیا ہے ؟ اس سوال کا جواب طویل ہے ۔ صرف دو شعر پیش کرتا ہوں :

ملتے خاکسترِ او بے شرر صبحِ او از شامِ او تاریک تر

ایک ایسی جماعت ، جس کی راکھ میں کوئی چنگاری نہیں ، جس کی صبح — شام سے بھی زیادہ تاریک ہے — یہ اس لیے کہ :

ہر زماں اندر تلاشِ ساز و برگ کارِ او فکرِ معاش و ترسِ مرگ

ہر وقت مادی آرائش و اسباب کی تلاش میں غرق ۔ جسمانی لذات کی فکر میں مگن اور موت کے خوف سے لرزاں ۔

دیکھا آپ نے ایمان کی صبح شاداب و تاباں اور کفر کی صبح تاریک و ترساں ۔

اسی مثنوی ''پس چہ باید کرد'' میں ایام عرب کی صبح یاد دلاتے ہیں :

با تو می گویم ز ایامِ عرب تا بدانی پختہ و خامِ عرب

* * *

الدریں دیرِ کہن پیہم تپید تا جہانے تازہ آمد پدید

یہ مقدس جماعت دنیائے جدید کی خالق کہلائی ۔ بقول حالی

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے یہ سب پود انہی کی لگائی ہوئی ہے

اس موضوع پر مختلف زبانوں میں مبسوط کتابیں لکھی گئی ہیں ۔ غیر مسلموں تک نے اعتراف کیا ہے کہ موجودہ علوم و اکتشافات کے بانی وہی لوگ تھے جنھوں نے قرآن و اسلام کی آغوش میں پرورش و تربیت حاصل کی ۔ دنیا بھر میں جہاں بھی حق و صداقت کی کوئی آواز اُٹھی ، اس کا آغاز اسی پاک سرشت جماعت سے ہوا :

بانگ حق از صبح خیزی ہائے اوست ہرچہ ہست از تخم ریزی ہائے اوست

انہی کی صبح خیزیوں نے آوازۂ حق بلند کیا ۔ یہ جو کچھ آپ آج تہذیب و تمدن کی ترقیاں دیکھ رہے ہیں ، اس کی تخم ریزی انہی کے ہاتھوں ہوئی تھی ۔

ظاہر ہے کہ صبح کا وجود آفتاب سے ہے ۔ وہ اسی منبع سے اپنا نور حاصل کرتی ہے ۔ اسی لیے علامہ براہِ راست اس سے بھی خطاب فرماتے ہیں ۔ ان کا نصب العین وہاں بھی انفرادی اکتساب نہیں ہے ، بلکہ اجتماعی تنویر ہے ۔ مطلع ہے :

اے امیرِ خاور اے مہرِ منیر می کنی ہر ذرہ را روشن ضمیر

مہرِ منیر کی ضیا پاشیوں اور کارگزاریوں کی شرح و تفصیل بیان کرتے ہوئے صبح تک پہنچ جاتے ہیں :

خوش بیا صبحِ مرا آوردۂ ہر شجر را نخلِ سینا کردۂ

تو فروغِ صبح و من پایانِ روز در ضمیرِ من چراغے بر فروز

اپنے ضمیر کی چراغ افروزی سے کام لینا چاہتے ہیں :

تا بروز آرم شبِ افکارِ شرق بر فروزم سینۂ احرارِ شرق

ایک نورانی انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہیں :

از نوائے پختہ سازم خام را گردشِ دیگر دہم ایام را

تان کہاں پر آ کر ٹوٹتی ہے :

فکرِ شرق آزاد گردد از فرنگ از سرودِ من بگیرد آب و رنگ

دیکھا آپ نے کہاں سے چلے اور کہاں پہنچ گئے !

آزاد اور غلام کا فرق بتاتے ہوئے بہت سے نکتوں کی گرہ کشائی فرماتے ہیں ۔ اس کے بھی دو شعر سنیے :

ما ہمہ عبدِ فرنگ او عبدہٗ او نگنجد در جہانِ رنگ و بُو

صبح و شامِ ما بہ فکرِ ساز و برگ   آخرِ ما چیست! تلخی ہائے مرگ؟

آزاد کا ظرف و حوصلہ صرف حیاتِ مادی پر قانع نہیں :

طرح نو افگن کہ ما جدّت پسند افتادہ ایم
این چہ حیرت خانۂ امروز فردا ساختی

وہ اس خدا کا بندہ ہوتا ہے جس کی شان ہے وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۔ اس کا تختِ عظمت تمام آسمانوں اور زمین کا احاطہ کیے ہوئے ہے — اور غلام فرنگی کی غلامی سے نکلنے کی راہ نہیں پاتا ۔ آج کہ ہم بظاہر چھبیس برس سے آزاد ہو چکے ہیں ، لیکن ہمارے افکار و اعمال بدستورِ سابق فرنگی کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں — وہی نظامِ تعلیم ، وہی نظامِ عدل ، وہی فیشن پرستی اور الحاد نوازی ۔ انگریز ہماری صبحوں اور شاموں کو صرف دنیوی ساز و سامان اور نمائش کی فکر دے گیا ہے ۔ ہمارا انجام کیا ہے ؟ — موت کی تلخیاں اور بس ۔

آئیے اب ذرا لغت کی سیر کر لیں ۔ عربی زبان میں آخرِ شب کے متعلق کئی الفاظ آئے ہیں ۔ ان میں زیادہ مشہور سحر ، فجر ، صبح اور غدوہ ہیں جو قرآن حکیم میں استعمال کیے گئے ہیں ۔ سحر رات کے آخری حصے کو کہتے ہیں یا صبح سے ذرا پہلے ۔ امام راغب نے آخرِ شب کی تاریکی کو دن کی روشنی میں خلط ملط ہونے کے وقت کو سحر کہا ہے ۔ "مصباح اللغات" نے السحر الاعلیٰ یعنی صبح کاذب والسحر الآخر یعنی صبح صادق لکھا ہے ۔ صبح کے متعلق راغب لکھتے ہیں کہ یہ اس وقت کا نام ہے جب افق طلوع آفتاب کی وجہ سے سرخ ہو جائے ۔ "مصباح" میں اصبح کے معنی آدھی رات میں بیدار ہونا لکھے ہیں اور دن کے ابتدائی حصے کو بھی صبح کہا ہے ۔ الفجر کے معنی پھاڑنے اور شق کر دینے کے ہیں ۔ اس وقت کو اس وجہ سے فجر کہتے ہیں کہ صبح کی روشنی رات کی تاریکی کو پھاڑ کر باہر نکل آتی ہے ۔ علامہ اپنی صبح کو تین یا چار بجے آخرِ شب سے شروع کرتے ہیں ۔ چنانچہ مہاراجہ سر کشن پرشاد شاد کو ۳۱ اکتوبر ۱۹۱۶ کے خط میں لکھتے ہیں : "صبح چار بجے ، کبھی تین بجے اُٹھتا ہوں ، پھر اس کے بعد نہیں سوتا ، سوائے اس کے کہ مصلّے پر کبھی اُونگھ جاؤں ۔"[۵] ایک دوسرے خط میں جو ۱۱ جون ۱۹۱۸ کو لکھا گیا ہے مہاراجہ کو لکھتے ہیں : "ان شاء اللہ کل صبح کی نماز کے بعد دعا کروں گا ۔ کل رمضان کا چاند یہاں دکھائی دیا ۔ آج رمضان کی پہلی ہے ۔ بندۂ روسیاہ کبھی کبھی تہجد کے لیے

۵- "اقبالِ کامل" ، ص ۳۷ ، بحوالہ "مکاتیب شاد و اقبال" ، ص ۱۹ ۔

اُٹھتا ہے ۔ سو خدا کے فضل و کرم سے تہجد سے پہلے بھی اور بعد بھی دعا کروں گا ۔ اس وقت عبادت الٰہی میں بہت لذت حاصل ہوتی ہے ۔ کیا عجب ہے کہ دعا قبول ہو جائے ۔''٦

ان چند سطور میں کتنی باتیں آ گئیں :

(۱) صبح خیزی
(۲) شب خیزی
(۳) عبادت میں حصولِ لذت
(۴) دعا پر اعتقاد

''اقبال اور دعا'' کا عنوان ایک الگ مقالے کا متقاضی ہے ۔ سردست ایک شعر سن لیجیے ۔ دعا کی سرگوشیوں اور اطمینان بخشیوں کا تجربہ رکھنے والوں کے لیے اسی شعر میں کئی مقالے سما گئے ہیں ۔ فرماتے ہیں :

بحرفے می توان گفتن تمنائے جہانے را
من از ذوقِ حضوری طول دارم داستانے را

ایسا شعر صرف شاعری اور قافیہ پیمائی نہیں ہو سکتا جب تک شاعر ذوقِ حضوری کی واردات سے نہ گزرا ہو ، اس کے کلام میں ایسی دل کش و دل آرام واقعیت پیدا ہی نہیں ہو سکتی ۔

دعا کے متعلق علامہ کے خیالات یا یوں کہیے کہ اکتشافات ایسے اہم و اخص ہیں کہ کم از کم میرے مطالعہ کی حد تک کسی محدث ، مفسر یا صوفی کی تصنیف میں نہیں پائے جاتے ۔ خطبات میں ایک خطبے کا عنوان یہی ہے : ''ذاتِ الٰہیہ کا تصور اور حقیقتِ دعا'' ۔ اس کی بعض سطور ملاحظہ ہوں : ''سائنس کچھ بھی کہے مجھے تو یوں نظر آتا ہے کہ جب تک دنیا قائم ہے دعا یا عبادت کا سلسلہ بھی قائم رہے گا ۔'' اس فقرے میں اس حدیث کی روح بول رہی ہے الدعا ، مخ العبادہ [دعا عبادت کا مغز ہے] ۔

مزید فرماتے ہیں : ''باعتبارِ نفسیات دعا یا عبادت ایک جبلی امر ہے ۔ دعا کا مرتبہ غور و تفکر سے بہت بلند ہے ۔ یہ بھی تفکر کی طرح تحصیل و اکتساب ہی کا ایک عمل ہے جو بحالت دعا ایک نقطے پر مرکوز ہو جاتا ہے اور ایسی قوت و طاقت حاصل کر لیتا ہے جو فکر محض کو حاصل نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ہمارا جی تو یہ چاہتا ہے کہ اگر خدا ہے تو ہمیں اس کی موجودگی کا حقیقی اور واقعی تجربہ ہو ۔ تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ ایسا تجربہ دعا یا عبادت ہی سے حاصل ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔

٦۔ ''اقبال کامل'' ، ص ۸۵ ، بحوالہ ''مکاتیب شاد و اقبال'' ، ص ۴۳ ۔

دعا گویا ان ذہنی سرگرمیوں کا لازمی تکملہ ہے ، جو فطرت کے علمی مشاہدے سے سر زد ہوتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ بلحاظ ایک نفسیاتی مظہر کے دعا ایک راز ہے ۔ ۔ ۔ ۔ دعا خواہ انفرادی ہو خواہ اجتماعی ، ضمیر انسانی کی اس نہایت درجہ پوشیدہ آرزو کی ترجمان ہے کہ کائنات کے ہولناک سکوت میں وہ اپنی پکار کا کوئی جواب سنے ۔ ۔ ۔ ۔ ''

اس فقرے میں آیہ اجیب دعوۃ الداع اذ ادعان کی جھلکیاں مل رہی ہیں ۔ یعنی ''میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب بھی وہ مجھے پکارے ۔''

علامہ مزید فرماتے ہیں کہ ''یہ انکشاف تجسس کا عدیم المثال عمل ہے ۔ ۔ ۔ ۔ دعا یا عبادت کا تعلق دراصل انسان کے باطن اور ضمیر سے ہے ۔ اس لیے اس کی شکلیں بھی مختلف ہیں ۔ لکل امۃٍ جعلنا منکاً ہم ناسکوہ ۔ ۔ ۔ ۔ یعنی ہم نے ہر امت کے لیے ایک طریقہٗ عبادت مقرر کر دیا ہے ۔ وہ لوگ اسی کے مطابق دعا و عبادت کا فریضہ ادا کرتے ہیں ۔''

میں نے طوالت سے بچنے کے لیے نہایت اختصار و تلخیص سے کام لیا ہے ، ورنہ یہ پورا خطبہ اس قابل ہے کہ قرآن حکیم کی روشنی میں اس کی مفصل شرح کی جائے اور اس میں عرفان و ایقان کی حقیقتوں کا مشاہدہ کیا جائے ۔

یہ خوشی اور اطمینان کی بات ہے کہ علامہ کے کلامِ نظم و نثر کی طرف عالمی سطح پر توجہ کی جا رہی ہے ، اس کو غور و فکر کا موضوع بنایا جا رہا ہے ۔ لیکن آخر میں میں یہ عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ ، ایک پرانے اقبال شناس کے بقول ، علامہ کو اگر انگریز سمجھ لیتا تو وہ ایک دن بھی جیل سے باہر نہ رہتے ، اور اگر مسلمان سمجھ پاتا تو وہ ایک دن بھی غلامی کی زندگی گوارا نہ کرتا ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عملی لحاظ سے ان کی تعلیمات و پیام کو سمجھنا ابھی باقی ہے ۔ یہی سوچ کر سفرِ آخرت کی تیاریوں کے زمانے میں ان کے قلب سے یہ خروش اُٹھا تھا :

چو رخت خویش بربستم ازیں خاک   ہمہ گفتند با ما آشنا بود
و لیکن کس ندانست ایں مسافر   چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

[یہ مقالہ یوم آزادی کی تقریب کے سلسلے کی ایک خصوصی نشست میں جو اقبال اکادمی کی جانب سے منعقد ہوئی تھی ، ۱۷ اگست ۱۹۷۴ء کو پڑھا گیا ۔]

ڈاکٹر محمد ریاض

چوہدری محمد حسین مرحوم ، اقبال دوست اور اقبال شناس

علامہ اقبالؒ کی کسی کتاب کو دیکھیں ، صفحہ اول کے اندر یہ عبارت لکھی ہوئی دکھائی دے گی : ''زیر نگرانی چوہدری محمد حسین ، ایم - اے -'' ۱۹۷۳ میں جناب ڈاکٹر جاوید اقبال نے علامہ مرحوم کے کلام کے اُردو اور فارسی کلیات دیدہ زیب صورت میں اپنی نگرانی میں طبع کروانے اور اس ضمن میں مولانا غلام رسول مہر مرحوم کی معاونت کا اعتراف کیا -[1] ان مجموعوں میں مندرجہ بالا عبارت نظر نہیں آتی ، مگر ظاہر ہے کہ ان کلیات یا تہران میں طبع شدہ فارسی کلیات[2] کی اساس بھی ان ہی مجموعوں پر ہے جو چوہدری مرحوم کی زیر نگرانی لاکھوں کی تعداد میں طبع ہو چکے ہیں - اقبال کی زندگی کے آخری بیس سالوں میں جو حضرات ان سے ملتے گئے ، ان کی اکثریت نے علامہ کے ہاں چوہدری موصوف کی موجودگی کا ذکر کیا ہے - ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۵ کو علامہ نے اپنے صغیر سن بچوں ، جاوید اور منیرہ بانو کی ذات اور جائداد کے لیے جن چار افراد کو ولی مقرر کیا ، چوہدری مرحوم ان میں سے ایک تھے[3] - آپ نے وصیتِ اقبال پر عمل کروانے کے ضمن میں باقی حضرات کے ساتھ جس خوش اسلوبی سے تعاون کیا ، اس کی مثال دورِ حاضر میں

۱- اُردو کلیات میں ''ضربِ کلیم'' کے یہ افتتاحی اشعار نامعلوم کیوں حذف ہو گئے ؟—

نہیں مقام کی خوگر طبیعتِ آزاد — ہوائے سیر مثالِ نسیم پیدا کر
ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے — خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

۲- طبع اول ۱۹۶۳ ، طبع دوم ۱۹۷۲ ، باضافات - مقدمہ نگار ، احمد سروش فوت ہو گئے ہیں -

۳- باقی حضرات حکیم طاہر دین ، خواجہ عبدالغنی اور شیخ اعجاز احمد تھے -

بمشکل ہی مل سکے گی ۔ علامہ مغفور کی وفات کے چند ماہ بعد آپ نے ''ارمغان حجاز'' کی اشاعت کا اہتمام کیا ، مزار اقبال کی تعمیر کے لیے اپنی خاص توجہ و سعی مبذول رکھی اور سنٹرل اقبال کمیٹی نیز دیگر اداروں کے ذریعے ، پیغام اقبال کی تفہیم و تسہیل کی خاطر اپنی مخلصانہ کوششیں جاری رکھیں ۔ اس اقبال دوستی کے علاوہ ان کے مقالات مظہر ہیں کہ وہ بالغ نظر اقبال شناسا بھی تھے اور اس خاطر لائق قدردانی ہیں ۔

چوہدری محمد حسین کو اقبال کی طویل صحبتیں میسر رہیں ۔ علامہ کا ایک ایک شعر ان کے ذریعے پریس جاتا رہا ۔ ''پیام مشرق'' کے پُرمغز دیباچے کے آخر میں اقبال نے چوہدری مرحوم کے تسوید اوراق کے لیے کوشش کرنے کا خصوصی شکریہ ادا فرمایا ہے ۔ بعد کے سالوں میں دونوں کے روابط اس قدر قریبی ہو گئے تھے کہ ادائے تشکر غیر ضروری اور نرا تکلف ہوتا ۔[۴] جاوید کے ساتھ علامہ نے جو سرہند شریف کا سفر اختیار کیا ، اس میں مسافر سوم چوہدری مرحوم ہی تھے ۔ علامہ کے معروف فلسفیانہ لکچرز کے دوران بھی چوہدری موصوف نے جنوبی ہند تک ان کی معیت کی تھی ۔ سفر و حضر کے اس ساتھ نے چوہدری صاحب کو کلامِ اقبال کے سیاق و سباق کا غیر معمولی شناسا بنا دیا تھا ۔ وہ مصنف کے سوزِ دل اور اس کے بظاہر غیر مرئی اشارات کے دانا تھے ۔ مندرجہ ذیل شعر میں ''درویشی'' سے گاندھی جی کی سیاست اور ''سلطانی'' سے پنجاب میں سر سکندر حیات کی یونینسٹ حکومت ، شاعر کے حوالے سے ، استنباط کرنا ، چوہدری مرحوم کی علائم دانی کی ایک مثال ہے :

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیّاری ہے ، سلطانی بھی عیّاری

مختصر حالاتِ زندگی ۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کے ایک مقالے کے بموجب ،[۵] چوہدری محمد حسین ۸ مارچ ۱۸۹۳ کو پسرور (ضلع سیالکوٹ) میں پیدا ہوئے ۔ اُردو ، فارسی اور عربی کے فاضل تھے ۔ عربی میں ایم ۔ اے ۔ کی سند رکھتے تھے ۔ قرآن مجید ، احادیث اور اسلامی اصولِ فقہ کا اُنھوں نے بنظر غائر مطالعہ کیا

۴۔ مثنوی ''بندگی نامہ'' (''زبورِ عجم'') میں مندرجہ ذیل شعر کے حذف چاپ اول کی خاطر دیکھیے مرحوم کا نوٹ :

علمِ حاضر پیش آفل در سجود شک بیفزود و یقین از دل ربود

۵۔ ہفت روزہ ''چٹان'' لاہور ، ۲۱ اپریل ۱۹۵۷ ، دوبارہ مشمولہ ''مئے لالہ فام'' ۔

تھا ۔ بڑے دین دار اور صاحب دل شخص تھے ۔ زندہ دلی اور ظرافتِ طبعی اس پر مزید تھی ۔ شاعر تھے اور اکبر الہ آبادیؒ مرحوم کے رنگ میں ظریفانہ اشعار کہتے رہے ۔ روزنامہ ''الاثر'' اور ''زمیندار'' میں ان کی غزلیں اور منظومات شائع ہوتی رہیں ۔ مگر اقبال کے کہنے پر اُنھوں نے مشغلۂ شاعری کو یکسر ترک کر دیا تھا ۔ علامہ کا مشورہ یہ تھا کہ شاعری میں ان کا رنگ جم نہ سکے گا ۔ چنانچہ چوہدری صاحب نے طبع آزمائی سے صرف نظر کر لیا ۔

۱۹۱۷ سے چند سالوں تک چوہدری موصوف نواب ذوالفقار علی خاں کے بچوں کے اتالیق رہے ۔ نواب مرحوم چونکہ علامہ کے قدر دان دوست تھے ، اس لیے چوہدری صاحب کے لیے وسیلۂ تعارف ہاتھ آیا اور یہ تعارف ، طبائع کی قربت اور یکسانی کی بنا پر ، مخلصانہ دوستی پر منتج ہوا ۔ ''بانگ درا'' کا ایک نسخہ پیش کرتے وقت علامہ اقبال نے چوہدری صاحب کے لیے ایک شعر لکھا تھا جو اب ''زبور عجم'' کی ایک غزل کا مطلع ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں دوستیِ محمد حسین ''مقامِ رضا'' کے مصداق تھی ۔ سبحان اللہ :

برون کشید ز پیچاک ہست و بود مرا
چہ عقدہ ہا کہ ''مقام رضا'' گشود مرا

چوہدری موصوف کا مدتوں تک انجمن حمایت اسلام لاہور سے تعلق رہا اور اس کے زنانہ کالج کے وہ آنریری سیکرٹری بھی رہے ۔

۱۹۲۶ میں وہ پنجاب سول سیکریٹریٹ کی پریس برانچ میں ملازم ہوئے ۔ یہاں اُنھوں نے اتنی ترقی کی کہ برانچ کے مختار اعلیٰ بنے اور خان و خان بہادر کے خطابات بھی ملے ۔ وہ ''ادب برائے زندگی'' کے اُس نظریے کے شدت سے قائل تھے جسے اقبال نے بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ سعادت حسن منٹو کے کئی ''ادب برائے ادب'' افسانے جن رسالوں میں چھپے ، چوہدری صاحب نے وہ رسالے ضبط کرا دیے تھے ۔ چوہدری موصوف اقبال پر بے ہدف تحقیقات و توضیحات کی بھی حوصلہ افزائی نہیں کرتے تھے ۔

چوہدری محمد حسین کا علامہ کی زندگی کے آخری بیس سالوں میں یہ معمول تھا کہ وہ روزانہ بلا ناغہ مجلسِ اقبال میں حاضری دیتے رہے ۔ وہ دیگر احباب اور ارادت مندوں کے چلے جانے کے بعد بھی دیر تک علامہ کے پاس بیٹھے رہتے ۔ علامہ کا تازہ کلام سنتے اور مختلف مسائل پر دوستانہ انداز میں تبادلۂ خیال فرماتے ۔ بے تکلفی کی بنا پر چوہدری صاحب علامہ کی محفلوں میں کھل کر قہقہہ لگاتے مگر شاعرِ مشرق کی وفات کا غم دیکھیے کہ پھر کسی نے اُنھیں

مسکراتے بھی نہ دیکھا۔ بے تکلفی کا ایک دوسرا واقعہ یہ ہے کہ علامہ اقبال اپنی بیماری کے زمانے میں چوہدری صاحب کے لیے لذیذ اور مرغن کھانے پکواتے، اُنھیں پاس بٹھا کر کھلواتے اور محظوظ ہوتے۔ چوہدری ممدوح ۱۶ جولائی ۱۹۵۰ کو ستاون برس کی عمر میں انتقال فرما گئے۔ پسماندگان میں ان کی چھ بیٹیاں اور تین بیٹے رہے۔

اقبال شناس ۔ علامہ اقبال کی تین فارسی کتب ''اسرار خودی''، ''زبور عجم'' اور ''جاوید نامہ'' کے تعارف میں چوہدری محمد حسین کے تین مضامین ہمارے پیش نظر ہیں ۔ یہ مضامین، خصوصاً آخری دو، اقبال شناسی کا شاہکار کہے جا سکتے ہیں۔ یہ مذکورہ کتب کی اشاعت کے کچھ دن بعد لکھے اور چھپوائے گئے، اور اشاعت سے قبل، ان کے محتویات علامہ کو ضرور معلوم ہوئے ہوں گے ــ بلکہ بین السطور میں جگہ جگہ فیض اقبال جھلکتا ہے۔ معاصرانہ چشمک سے توبہ! چوہدری مرحوم کے مخالفین ان مضامین کی عظمت کے منکر نہ ہو سکتے تھے، مشہور کر دیا کہ یہ خود علامہ نے لکھوائے تھے۔ ہمارے خیال میں جس شخص کو علامہ نے معتمد اور بے تکلف دوست بنایا، اور جو ان کی اولاد کا شفیق محسن بنا، اس پر بے کفایتی اور نا اہلی کے الزامات تراشنا، سوء ادبی اور کور ذوقی کی دلیل ہے۔ یہ مضامین اور دیگر لائق اعتنا تحریریں چوہدری مرحوم کی اپنی ہیں اور اُنھیں حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی سند قبولیت حاصل ہے۔

''اسرار خودی اہل مغرب کی نظر میں'' ایک مختصر مضمون ہے[6] اور غالباً ۱۹۲۱ کے اواخر میں لکھا گیا۔ مضمون نگار نے پہلے اقبال کے غیر معمولی نبوغ، مؤثر شخصیت، خودی و بے خودی کے انقلابی پیغام اور خواجہ حافظ شیرازی پر انتقاد کے ادبی اسلوب کی حقیقت پر روشنی ڈالی۔ ازاں بہ بعد امریکی فاضل نقاد، ادیب اور فلسفی ہربرٹ ریڈ کے ''اسرار خودی'' پر ایک تبصرہ، مطبوعہ اخبار ''نیو ایج'' (*New Age*) امریکہ مورخہ ۲۵ اگست ۱۹۲۱ کے اقتباسات نقل کیے ہیں۔ آخر میں پروفیسر نکلسن کے ترجمہ ''اسرار خودی'' کا ذکر ملتا ہے جس میں فاضل مترجم اس مثنوی کی انقلابی شان کے بارے میں رطب اللسان ہے۔

ایک امریکی نقاد مسٹر لارنس نے عظیم امریکی فلسفی شاعر وٹمین کے

۶۔ محمد عبداللہ قریشی، ماہ نامہ ''ادبی دنیا''، لاہور، ۱۹۶۷، ''اقبال نمبر'' شمارہ ۳۴۔

بارے میں کلماتِ احسنت کہے تھے ۔ ہربرٹ ریڈ تبصرہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ، ''اسرار خودی'' کے انگریزی ترجمے کے حوالے سے ، اقبال کی فکری برتری کا اثبات کرتا ہے ۔ چوہدری صاحب کے مضمون کا لبِ لباب یہ ہے کہ زندہ قوموں نے اقبال کے پیغامِ حیات پر لبیک کہا اور اسے بے چون و چرا ایک مبتکر مفکر مان لیا مگر برصغیر کے غلام اور تغافل شعار افراد مدتوں سے اس مثنوی کے بعض مطالب کی مخالفت میں سرگرم عمل ہیں ۔ خواجہ حافظ کے کلام پر ایک ادبی انتقادی بحث کا سلسلہ ناقابلِ اختتام بنا رہا اور اصل مطالب کی طرف سے چشم پوشی کی جاتی رہی ۔ چوہدری مرحوم فرماتے ہیں کہ دستِ قدرت نے اقبال ایسے نابغہ کو مسیح بنا کر اس لیے برصغیر بھیجا کہ یہاں کے باشندے ، خصوصاً مسلمان ، اس کے پیغام سے حیاتِ نو حاصل کریں ۔ غیر معمولی افراد کا سوزِ نفس معمولی چیز نہیں ہے[7] پورے مشرق کو بالعموم اور عالمِ اسلام کو بالخصوص ، ''اسرارِ خودی'' کے ''درسِ خود شناسی'' کی قدر کرنا چاہیے تھی مگر یہاں تو چراغ تلے اندھیرے والی مثل سامنے آتی ہے ۔ دورِ زوال میں قومیں خوب و ناخوب کی تمیز سے بے بہرہ ہو جاتی ہیں ۔[8] چنانچہ :

''ہمارے نقاد ، مثنوی اسرارِ خودی کی کسی ایک خوبی کو آج تک پورے طور پر واضح نہ کر سکے ۔ اس کے مطالب و معانی کا کماحقہ' ادراک نہ کر سکے ۔ یہ نہ جان سکے کہ سلسلہ' خیالات کس ربط و ضبط کے ساتھ زمین پر مرکز گیر ہوئے اور کس قوت و اعجاز کے ساتھ فضائے بسیط میں توسعہ پذیر ہوئے ۔ اُنھوں نے علمِ ادب کی حقیقت سے اپنے بے بہرہ ہونے کا ثبوت اس طرح دیا کہ اسرارِ خودی میں خواجہ حافظؒ پر ایک ادبی انتقاد کو اُنھوں نے خواجہ موصوف کی بزرگی پر حملہ سمجھا ۔ یوں وہ ادب اور انتقاد سے در ماندہ رہے اور خودشناسی سے مراحل دور جا پڑے ۔''

ہربرٹ ریڈ کو اقبال کے فرد و معاشرے کے بارے میں معتدل خیالات ، جن کا ذکر نکلسن نے ''اسرارِ خودی'' کے دیباچے میں ''اسرار و رموز'' کے حوالے سے کیا ہے ، بے حد پسند تھے ۔ وہ لکھتا ہے کہ نٹشے الہانی کا فوق البشر کا تصور ، معاشرے سے دوری اختیار کرنے کی تعلیم ہے ۔ وٹمین امریکی کی لفظی

۷- مقامِ گفتگو کیا ہے اگر میں کیمیا گر ہوں
یہی سوزِ نفس ہے اور میری کیمیا کیا ہے ؟ (اقبال)

۸- تھا جو نا خوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر (اقبال)

صنعت گری دل آویز ہے مگر معانی ندارد ۔ اس کی تحریریں ابدی حقائق سے محروم ہیں ۔ اقبال نے لفظ و معنی میں تعادل و توازن پیش کیا ۔ اس کا ''انسانِ کامل'' پوری انسانیت کا راہنما ہے اور ہمدرد و دل سوز بھی ۔ اقبال کے خیالات میں تصوریت سے زیادہ عملیت ہے اور عالمِ اسلامی کو ایسے مفکر کی ضرورت ہے جو انسانیت دوست ہو اور عملی دنیا سے سروکار رکھتا ہو ۔ چوہدری محمد حسین فرماتے ہیں کہ کاش اقوامِ مشرق بھی غربیوں کی مانند ''اسرارِ خودی'' کے مطالب کی طرف متوجہ ہو جائیں ۔

دوسرا مضمون ۔ ''زبورِ عجم'' پر چوہدری محمد حسین کا بصیرت افروز مضمون اس کتاب کی اشاعت کے زمانے میں ۱۷ جولائی ۱۹۲۷ کے روزنامہ ''انقلاب'' کی اشاعتِ خاص میں چھپا اور اسے دوبارہ منصّۂ شہود پر لانے کا فخر جناب محمد عبداللہ قریشی کو حاصل ہے ۔ مضمون کا سرنامہ اقبال کا مضمون نگار سے یہ ارشاد ہے کہ ''کاش کوئٹے نے زبورِ عجم[۹] کو پڑھا ہوتا ۔'' مقالے کے ابتدائیے میں چوہدری مرحوم اس امر کا افسوس کرتے ہیں کہ بعض لوگ اقبال کے اشعار تو بڑی ارادت سے پڑھتے نظر آتے ہیں مگر ان کے معانی کو جاننے اور اس طرح اپنی شخصیت میں انقلاب پیدا کرنے کی ضرورت سے غافل ہیں ۔ اس کے برعکس مداحینِ اقبال کا ایک ایسا گروہ موجود ہے جس نے کلامِ اقبال پڑھا ہی نہیں ۔ ایک واقعہ نقل فرماتے ہیں کہ ایک فاضل اقبال کا مندرجہ ذیل شعر بڑے پرسوز لہجے میں پڑھ رہا تھا :

اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا بن جائے گی

چوہدری صاحب نے بغرضِ اطلاع شعر کے معانی پر تبادلۂ خیال کرنا چاہا تو وہ بولا : ''اس پہلو پر میں نے کبھی غور ہی نہیں کیا ۔'' اسی طرح فضلا کی ایک جماعت علامہ کے دولت کدہ پر ان سے ملاقات کرنے گئی ۔ دورانِ گفتگو شاعرِ مشرق نے ایک شعر پڑھا کہ :

شعلہ ہائے او صد ابراہیم سوخت تا چراغِ یک محمد بر فروخت

اس جماعت کا فاضل ترین شخص بولا : ''ڈاکٹر صاحب ، اتنا عمدہ شعر کس نے کہا ہے ؟'' معلوم ہوا ان مداحانِ اقبال نے ہنوز ''اسرارِ خودی'' کا ابتدائی حصہ

۹۔ ''بالِ جبریل'' میں ہے (ص ۵۹) :

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبورِ عجم
نوائے نیم شبی بے نوائے راز نہیں

بھی نہیں پڑھا تھا ۔

تمہید کے بعد چوہدری صاحب لکھتے ہیں :

''اقبال شاعری کی منزل سے گزر چکے[۱۰] اور ایک پیغام کے امین بن گئے ہیں ۔ اس پیغام کے مخاطب برصغیر کے مسلمان ، یہاں کے عام باشندے اور دنیا بھر کے انسان ہیں ۔ شاعرِ مشرق کی مخاطب، اوّل مسلمانوں کی انحطاط یافتہ قوم ہے ۔ اس پر زوال کی صدیاں بیت گئیں ۔ اس لیے جس قدر سرعت سے دوسری قومیں زندہ ہوئیں ، مثلاً لیسنگ ، ہرڈر ، شلر اور گوئٹے کے پیغام سے جرمنوں کا احیا ، اس طرح اس قوم کے علی الفور بیدار و زندہ ہونے کی امید نہیں ہے ۔ اقبال اسی لیے اپنے پیغام کو نت نئے اسالیب کے ساتھ پیش کر رہے ہیں ۔ ان کی کوشش ہے کہ کسی اسلوبِ بیان اور صنفِ شاعری کے دلدادہ افراد اسے پڑھیں ۔ اس کتاب کے ذریعے اقبال نے عجمی اقوام کو حقیقی اسلام اور حریتِ واقعی کا پیغام دیا ، اس لیے 'زبور' (ٹکڑے) حضرت داؤد[ؑ] کو ملنے والی الہامی کتاب کا آسمانی نام لے کر اسے 'زبور عجم' موسوم کیا ہے اور دعا فرمائی :

خا کم بنورِ نغمۂ داؤد[ؑ] بر فروز   ہر ذرۂ مرا پر و بالِ شرر بدہ

''۔ ۔ ۔ ان دو مثنویوں کو چھوڑ کر جن میں سے ایک 'گلشنِ رازِ جدید' اسرارِ حیاتِ فرد کی نئے انداز کی تعلیم سے ، 'اسرارِ خودی' کی یاد تازہ کرتی ہے اور دوسری 'بندگی نامہ' جو محکومیت کی لعنتوں کے ذکر سے خائف و لرزاں ہونے پر مجبور کرتی ہے ۔ 'زبور عجم' کے پہلے حصوں میں ایسی نظمیں موجود ہیں جو مشرقِ غلام کی بیداری کے لیے لکھی گئی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر نے کتاب کا نام سوچا تو زبور کے ساتھ عجم کا لفظ خود بخود دل پر نازل ہوگیا ۔ گوئٹے کے 'سلامِ مغرب' کا جواب 'پیامِ مشرق' تھی ۔ 'زبورِ عجم' جہاں پیامِ عجم ہے وہاں زبور بھی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ پہلے حصے میں یہ کتاب دنیا کے سامنے دینِ حق کی اصولی بنیادیں پیش کرتی ہے ۔ دوسرے حصے 'گلشنِ رازِ جدید' میں حیاتِ انسانی اور حیاتِ عامہ کے نئے فلسفے کی خبر دیتی ہے ۔ 'بندگی نامہ' کتاب کے تیسرے حصے میں ہمیں وہ صحیح اصولِ انتقاد ہاتھ لگتے ہیں جن کی مدد سے فنونِ لطیفہ کو پرکھنا اور ان کے حسن و قبح پر نظر ڈالنا ضروری ہے ۔ مجموعی طور پر 'زبورِ عجم' عجم کے موجودہ بدنصیب ، بدحال ، اخلاق اور اقتصادی فسادات میں محصور افراد کا مرقع ہے اور ان کے لیے درس بیداری ۔ ۔ ۔ ۔''

۱۰- دیکھیے مثنوی ''گلشنِ رازِ جدید'' (''زبورِ عجم'') کی تمہید میں اقبال کی آراء ۔

بحث کے دوران چوہدری موصوف نے لکھا :

"اقبال کا داؤد ، اس کا خلیل اور اس کا کلیم ہم معنی الفاظ ہیں اور کسی منتظر ہستی کے مختلف کرشمہ ہائے حیات کے نام ہیں ۔ یہ مختلف کرشمے فردِ واحد میں جلال و جمال ہو کر نظر آئیں اور اس کی جبیں کو نورانی اور 'پرہیبت انوار دیں ، تو اسے مہدی کہا جائے جو اقبال کا 'مردِ کامل' ہے ۔ اقبال نے تابعِ مہدی مردِ کامل کے بے تابانہ انتظار کا اظہار اپنے کلام میں ایک نہیں ، بیسیوں جگہ کیا ہے اور اس کے لیے سینکڑوں پیرایہ ہائے بیان اختیار کیے ہیں ۔ اقبال کا چنگیز ، اس کا محمود و تیمور بھی مردان منتظر نظر آتے ہیں مگر ان میں 'مردِ کامل' کے ظلال کہاں ؟ ۔ ۔ ۔ جس طرح رات کے بعد سورج کا طلوع ہونا ضروری ہے ، اس طرح اقبال کی نظر میں مرد منتظر کی آمد بھی یقینی ہے ۔ کبھی وہ سوچتا ہے کہ وہ خود اس مرد منتظر کا نقیب اور پیش تاز ہے ۔ وہ اس کے 'پرشکوہ کاروان کا حدی خوان ہے ۔ 'جوانانِ عجم' کو خطاب کر کے وہ اپنی اس نقیبانہ شان کو الم نشرح فرماتا ہے :

اے جوانان عجم جانِ من و جانِ شما! چون چراغِ لالہ سوزم در خیابانِ شما

"۔ ۔ ۔ وہ ان کے حالات کی بہبودی اور وہاں بھی کسی مردِ منتظر کے گزر کی پیش بینی کرتا ہے :

می رسد مردی کہ زنجیرِ غلامان بشکند
دیدہ ام از روزنِ دیوار زندانِ شما

"۔ ۔ ۔ مقطع میں اعتراف کرتا ہے کہ میرے خیالات بزرگان عجم کی تعلیات کا 'عصارہ ہیں ۔ وہ اجنبی ہے نہ اجنبیوں سے مخاطب ہے ۔ جوانانِ عجم اگر اقبال کو پہچانیں گے تو اپنے ماضی سے لو لگائیں گے :

آتشی در سینہ دارم ، از نیا کانِ شما حلقہ گرد من زنید رای پیکرانِ آب و گل

مگر بحالت موجودہ ، عجم کے بے جان زندہ ، شاعر کے الفاظ میں پیکران آب و گل ، اقبال کی دعوتِ حریت پر بمشکل ہی لبیک کہہ سکیں گے ۔ ۔ ۔"

اقبال شاعرِ مشرق ہیں اور شاعرِ عالم بھی ۔ چوہدری صاحب فرماتے ہیں :

"ان کی کتاب 'پیامِ مشرق' کے نام کی محدودیت پر بعض احباب نے تبادلۂ خیال کیا تو اقبال نے اپنے مطمحِ نظر کی وسعت کے اظہار کی خاطر سورۂ بقرہ کی آیۂ مبارکہ کے ایک حصے 'للہ المشرق والمغرب' کو سرورق پر لکھوا دیا ۔ کتاب کے محتویات مظہر ہیں کہ شاعر کا خطاب جہانی ہے ۔ اُسے چہار سوئے عالم سے انس ہے ۔ مگر چونکہ سرزمینِ مشرق ، سر دست عقب ماندہ اور محکوم و مظلوم ہے ، اس

خاطر شاعرِ داعی کے لیے لازم تھا کہ وہ کمزوروں کی ہم نوائی کرتا[11] اور ظالموں کو کھری کھری سناتا ۔ اقبال نے یہی کام کیا ۔ اسی خاطر 'پیامِ مشرق' یا 'زبورِ عجم' کے ناموں سے دو چار مغالطہ نہیں ہونا چاہیے :

''جو شخص انسانوں کی اصلاح کے لیے اُٹھے گا ، وہ فطرتاً سب سے پہلے محکوموں اور مغلوبوں کا اس خاطر طرف دار ہوگا کہ وہ مظلوم و مقہور ہیں ۔ داعی جاہلوں کی حمایت کرے گا کہ اُنھیں عاقل بنائے گا ۔ وہ کمزوروں کی طرف داری کرے گا کہ وہ قوی دستوں کے پنجوں سے نجات پا لیں ۔ اقبال اسی روش پر کام زن رہے ہیں ۔ ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اور ان کی فکر کا ہر کرشمہ اسی کام کے لیے وقف رہا ہے ۔ وہ داعی خاص ہیں اور داعی عام بھی ۔ اس لیے ان کا کام بغایتِ مشکل اور صبر آزما ہے ۔''

''زبورِ عجم'' پر چوہدری مرحوم کا مضمون ، اقبال شناسی کے دلآویز نمونے پیش کرتا ہے ۔ فکر و فن کے کئی پہلوؤں کو مقالہ نگار نے سلجھایا اور سمجھایا ہے ۔ ہم ایک دو مختصر مثالوں پر اکتفا کر رہے ہیں ۔

''زبورِ عجم'' حصۂ اول کے سرورق پر اقبال نے ایک ہی شعر لکھا ہے :

ز برونِ در گذشتم ! ز درونِ خانہ گفتم !
سخن نگفتہ را چہ قلندرانہ گفتم !

اس شعر کی توضیح میں ، مجلس اقبال کا یہ خوش قسمت فیض یاب کیا خوب لکھتا ہے :

''حریمِ حقائق ذات ، زائر نے دیکھا تو وہ بستہ نظر آیا ۔ اندر جانے کی اجازت نہ تھی ۔ متولیوں نے حریم حرم پر نہ صرف سیاہ غلاف چڑھا رکھے تھے ، بلکہ ہزار نیرنگیوں اور شعبدہ بازیوں کے ذریعے عام زائرین کو گمراہ کر رہے تھے ۔ وہ اصل مرکز سے توجہ ہٹاتے اور خوش رنگ پردوں پر لوگوں کی نظریں جما دیتے ۔ شاعرِ داعی کو حریمِ حرم سے گزرنے کا اتفاق ہوا ۔ اس کی نگاہِ تیز پردوں کو چیر[12] کر اندر تک جا پہنچی اور دیکھا کہ متولی لوگوں کو بھول بھلیوں میں مبتلا کرتے ہوئے خود بھی حقیقتوں کو پہچاننا بھول گئے ۔ حقائق دیکھ کر وہ چپ نہ رہ سکا ۔ رازِ دروں کی باتیں کہنے لگ گیا ۔ متولیوں نے بڑی آنکھیں دکھائیں کہ افشائے راز نہ کرو مگر اُسے ان کے رعب داب اور احکام کی سختی کا کوئی لحاظ نہ رہا ۔ وہ کہنے لگا تو متولی حرم بھی مبہوت

۱۱- بجلالِ تو کہ در دل دگر آرزو ندارم
بجز این دعا کہ بخشی بکبوتران عقابی
۱۲- نگہِ بی ادب زد رخنہ ھا در چرخِ مینائی
دگر عالم بنا کن گر حجابی درمیان خواہی

ہو کر اس کے ہم نوا بن گئے ۔ قلندر کے نعروں نے سب کو ہمہ تن گوش اور بت بنا کر رکھ دیا ۔ پھر اس نے بے کانہ نغمے الاپے ۔ ۔ ۔ ۔ شاعر حیات ابدی کے انوار سے بصیرت کی دریوزہ گری کرتا اور اسرار نگفتہ کہتا ہے ۔ اُسے ہم جنسوں سے محبت ہے ۔ اس لیے اس کی آرزو ہے کہ جو کچھ اس نے دیکھا ، دوسرے بھی دیکھ لیں ۔[۱۳] ذات مطلق کو اپنی جلوہ پاشیوں میں لذت ملتی ہے ۔ اس لیے قلندر مشرق کو بیان حقائق کی کھلی چھٹی مل گئی اور اس نے سب کچھ کہ ڈالا ۔ ۔ ۔ ۔ ''

اقبال کو مسئلۂ زمان و مکاں سے بغایت دلچسپی تھی ، اگرچہ وہ اسے ساختہ و پرداختۂ خرد جانتے تھے :

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری نہ ہے زماں نہ مکاں ، لا الہ الا اللہ

چوہدری موصوف نے اخباری مضمون کی تنگی کا شکوہ کرتے ہوئے بھی ، اقبال کے مندرجہ ذیل شعر کی روشنی میں فکر اقبال کے سیر زمان و مکاں کا جو نقشہ ترسیم کیا وہ بصیرت افروز ، معانی آفرین بلکہ اپنی مثال آپ کا مصداق ہے :

برون زین گنبد در بستہ پیدا کردہ ام راہے
کز اندیشہ بر تر می پرد آہ سحر گاہے

ان کے مطالب کے ذیلی عناوین مندرجہ ذیل ہیں : خدا و انسان (عشق و دعوت) ، غزل و پیغام ، اقبال کی دعائیں اور ان کا ارتقا ، دین حقہ اور ایمان ، اقبال اور توحید حقیقی ، اصلاح و تزکیۂ دل ، اقبال اور خدا (انداز ہائے محبت) ، شکوے شکایتیں ، حیات حقہ کا حصول ، اقبال اور حکمائے آسمان ، رومی و اقبال اور خاص تعلیمات اقبال ۔

اقبال کی فارسی غزل پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جائے گا مگر ''زبور عجم'' کے حوالے سے چوہدری محمد حسین کے چند جملے بھی دیکھ لیں :

"پیام تسلسل مضمون کا نام ہے اور غزل شکست تسلسل کا ۔ ۔ ۔ ۔ اقبال صاحب پیغام ہے مگر اسے غزل کے ذریعے پیش کر کے اپنی فنکارانہ مہارت کا سکہ جما رہا ہے مگر ۔ ۔ ۔ ۔ زبور عجم کے ناظرین دیکھیں گے کہ جو ٹکڑے مکمل پیغام ہیں وہ زیادہ قافیوں کی تاب نہ لا سکے اور جہاں قافیے زیادہ آ گئے ، وہاں پیغام ٹکڑوں اور شذروں میں منقسم ہو کے رہ گیا ہے ۔ اقبال نے انتہائی کوشش کی ہے کہ غزل کو پیغام کے مرتبے تک جا پہنچائے ۔ یہ قابل صد آفرین کوشش ہے اور مشرق علم ادب کی تاریخ میں پہلی کوشش ہے ۔ آج سعدی ،

۱۳- محروم تماشا کو پھر دیدۂ بینا دے
دیکھا ہے جو کچھ میں نے ، اوروں کو بھی دکھلا دے

حافظ ، عرفی ، نظیری ، صائب اور غالب زندہ ہوتے تو اپنے فن کو نقطۂ کمال تک پہچا دیکھ کر مسرور ہوتے ، لیکن جب وہ دیکھتے کہ اقبال نے غزل کو پیغام تک لے آنے میں اسے بعض ضروری لوازم سے محروم کر دیا جیسے مطلع کہیں کہیں نہیں لکھتا ، مقطع کی تو پروا نہیں کرتا اور تعدادِ اشعار میں بالکل آزاد ہے تو غالباً وہ اقبال کی غزل کو کوئی نام دیتے جسے ہم پیش بینی[14] نہیں کر سکتے ۔ ۔ ۔ ۔"

یہ مضمون بتیس صفحات کا حامل ہے ۔

"جاوید نامہ" پر ایک نظر ۔ اس ذیلی عنوان پر چوہدری موصوف کا شاہکار اور اس کتاب کے شایانِ شان مضمون مجلۂ "نیرنگ خیال" کے معروف اقبال نمبر میں شائع ہوا اور بعد میں "شرح جاوید نامہ" مؤلفہ مولانا صبغۃ اللہ بختیاری ، "شرح جاوید نامہ" از یوسف سلیم چشتی اور کئی دیگر کتابوں میں کلاً یا جزواً نقل ہوتا رہا ۔ راقم الحروف نے اس کے ابتدائی حصے کا فارسی ترجمہ[15] بھی شائع کروایا ہے ۔

"جاوید نامہ" معراج نامہ کے انداز کی ایک لازوال تصنیف ہے جسے علامہ مغفور نے ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۱ء کے تین سالہ عرصے میں مکمل فرمایا ۔ حضرت ختمی مرتبت ؐ کی روایاتِ معراج کے تتبع میں کئی عرفانی اور ادبی معراج نامے لکھے گئے ۔ ان میں شیخ محی الدین ابن عربیؒ (م ۶۳۸ھ) کی "فتوحات المکیہ" اور "کتاب التجلیات" ، شیخ بایزید بسطامیؒ (قرن سوم ھ کے عارف) کے بعض بیانات ، احمد قرطبی (م ۴۲۶ھ) کا رسالہ "التوابع و الزوابع" ، ابوالعلاء معری شامی (م ۴۴۹ھ) کا رسالہ "الغفران" ، حکیم سنائی غزنوی (م ۵۳۵ھ) کی مثنوی "سیر العباد الی المعاد" اور ڈینٹے اطالوی (م ۱۳۲۱ء) کی "ڈیوائن کمیڈی" خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ پروفیسر آسن ہسپانوی نے ، جن سے اقبال سفر اسپین کے دوران ملے تھے ، با دلائل ثابت کیا ہے کہ ڈینٹے ابن عربی کا خوشہ چیں رہا ہے ۔

چوہدری صاحب لکھتے ہیں :

" 'گلشن راز جدید' کی مانند ، اقبال علومِ حاضرہ کی روشنی میں 'معراج نامہ جدید' لکھنا چاہتے تھے مگر پروفیسر آسن کی تحقیقات[16] نے اُنھیں

۱۴- ایرانیوں کی اصطلاح میں سبکِ اقبال ۔
۱۵- مجلہ دانش کدہ ادبیات ، مشہد ، زمستان ، ۱۳۵۱ ش ۔
۱۶- Asin Palacios Miguel, Tr. Harold Sutherland, *Islam and Divine Comedy*, London 1929 ۔

'جاوید نامہ' لکھنے کی طرف مائل کیا ۔ اس کتاب کے مطالب چونکہ دائمی نوعیت کے ہیں ، اور کتاب کے آخر ایک جداگانہ حصے میں شاعر مشرق نے اپنے فرزند جاوید اقبال سے 'خطاب بہ جاوید' (سخنے بہ نژاد نو) کے زیر عنوان خطاب فرمایا ، اس خاطر کتاب کا یہ نام رکھا گیا ہے ۔

"معراج کی روایات نے مختلف اسالیب اختیار کیے ۔ مشاہدۂ تجلی ذات تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کو ملا ، نہ مل سکتا ہے ۔ صوفیہ اور عرفا مثلاً بایزید بسطامی اور ابن عربی کی معراج ، روحانی مشاہدۂ تجلی ذات کا ذکر ہے ۔ ابو عامر احمد قرطبی اور ابوالعلاء معری کا بیان معراج ، ادبی اور فنی نوعیت کا ہے ۔ شہر زوری کا ایک قصیدہ 'سفر روح' جو ابن خلکان کی 'وفیات الاعیان' میں منقول ملتا ہے ، وہ بھی اسی نوعیت کا ہے ۔ 'ڈیوائن کمیڈی' معراج کی عارفانہ روایات سے اثر پذیر ہے مگر اس کا اسلوب از اول تا آخر ادبی ہے اگرچہ مصنف نے 'فتوحات المکیہ' کے تراجم کو پیش نظر رکھا تھا ۔ علامہ اقبال کا 'جاوید نامہ' بھی ادبی معراج نامہ ہے اور فارسی زبان میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی اور اب تک آخری کتاب ہے ۔ یہ قوت خیال کا مظہر ہے نہ کہ واردات باطن اور مکاشفات روحانی کا ۔ اقبال نے ابن عربی اور ڈینٹے کے نمونے خاص طور پر سامنے رکھے ، اور احادیث معراج سے استفادہ کرتے ہوئے، اس کے تخیل نے کتاب میں فکر وفن کے ایسے لازوال نمونے پیش کر دیے جو کتب سابقہ میں مفقود تھے ۔ مثلاً : اقبال نے مشکل تمثیلات اور معنوی متاشبہات سے دامن بچائے رکھا ۔ اپنی سیاحت کو سات کے بجائے چھ افلاک تک محدود رکھا ۔ 'آنسوئے افلاک' کے حصے میں اہل عالم کو جنت ، حضور اور تجلی کے نئے مفاہیم سے نوازا اور ندائے جمال کے ذریعے 'سمیع اللہی' کا فخر مؤدبانہ انداز میں حاصل فرمایا ۔ اعراف اور دوزخ کے قریب جانے کے بجائے ، اقبال نے غداران ملت و میہن کی خاطر ماورائے دوزخ ، قلزم خونین کا صحنہ قائم کیا ۔ ابن عربی اور ڈینٹے نے حیات اخروی اور یوم قیامت کے اثبات کے مباحث پیش کیے ، اقبال نے ان مسلمہ امور پر توجہ صرف نہ کی ۔

''اس کے نزدیک یہ بات اس قدر اہم نہیں کہ مرنے کے بعد بہشت ، دوزخ یا اعراف میں انسانوں کی زندگی کیسے ہوگی ۔ جس بات نے اس کو تمام عمر پیچ و اضطراب میں رکھا ، وہ یہ انسانی زندگی ہے جو اقوام مشرق کے لیے سیاسی و اقتصادی پستی کی بنا پر موت سے بدتر ہو چکی اور جسے اس کے پاکیزہ ارتقا کی ضرورتوں سے روک کر اہل مغرب دینی ، روحانی اور اخلاق تنزل کا شکار ہوگئے ۔ ۔ ۔ ۔ بقا و دوام حیات انسانی کے مباحث بس اشارہ کرتے ہیں کہ اقبال نے اس تصنیف کا نام 'جاوید نامہ' کیوں رکھا ۔ ۔ ۔ ۔''

اس مقدمے کے بعد چوہدری صاحب نے ''جاوید نامہ'' کے اہم مباحث کی بصیرت افروز انداز میں تلخیص و تفہیم پیش کر دی ہے ۔ فرماتے ہیں :

''فلک قمر سے قبل فلسفہ' معراج ہے اور اس کے بعد معراجِ شاعر۔ محی الدین ابن عربی اور ڈینٹے دونوں کا آغازِ سیاحت ایک پہاڑ کے قرب سے ہوا۔ اتفاق ہے کہ اقبال کے سامنے بھی رومی کی راہنمائی فرما ، ایک پہاڑ کے عقب ، سے نمودار ہوتی ہے :

"روحِ رومی پردہ ہا را بر درید   از پسِ کُہ پارہ می آمد پدید"

''جاوید نامے'' کی بعض توضیحات جو چوہدری محمد حسین نے بڑی سادگی سے بیان کیں ، کتنے قارئین کی نظر سے نہ گزری ہوں گی ۔ امثلہ بہت ہو گئیں ۔ پھر بھی چند جملے نقل کرنے کو جی چاہتا ہے :

''وادی یرغمید ۔۔۔ کا نام فرشتوں کی زبان میں وادیِ طواسین ہے۔ حسین منصور حلاج کی تالیف کتاب الطواسین فرانس میں طبع ہو چکی ہے ۔ اس کی جدت کا کمال تھا کہ کتاب کے حصص یا ابواب کو طٰسٓ کی جمع طواسین کا نام دیا ۔ طٰسٓ قرآن مجید کی ایک سورہ کا نام ہے اور یہ حروفِ مقطعات بھی ہیں ۔ پس طواسین ، الواح یا منازل یا ابواب یا فصول کی جگہ لایا ہے ۔ وادی میں پیغامبران کرام سے بالمشافہ گفتگو مانع ادب تھا ۔ اس خاطر اقبال نے گفتگو کرنے کے بجائے ان کی تعلیمات کو الواحِ کوہ قمر پر مرتسم دکھانا مناسب جانا اور ان کے ذریعے چار رسولوں کی تعلیمات کے کلیات واضح کر دیے۔۔۔

''فلک مشتری پر ۔۔۔ میرزا غالب سے ان کے ایک اُردو شعر کے ، اُسے فارسی میں بدل کر ، معانی پوچھے ہیں ۔۔۔ اس شعر کے مفہوم پر بعض ادبی رسائل و کتب میں عرصہ ہوا بحث چھڑی تھی جسے شاعر نے پڑھا ، مثلاً معارف کے کسی شمارے میں ایک صاحب کا مضمون ۔ اس سے شاعر نے شعر کی تشریح خود غالب کے فرمودات کی روشنی میں 'جاوید نامہ' میں لکھنا مناسب جانا ۔۔۔ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے حقائق و اسرار پر بحث بھی غالب کے تضمین شدہ شعر کی روشنی میں لکھی گئی ، مگر پردۂ اسرار کو یہاں حسین منصور حلاج کی کتاب الطواسین چاک کرتی ہے ۔۔۔''

چوہدری محمد حسین کے ان مضامین[17] کو اگر ایڈٹ کر کے جدید اسلوب کے مطابق یک جا کر دیا جائے ، تو یہ ان کی اقبال دوستی اور اقبال شناسی کو خراج تحسین ہوگا اور تفہیمِ اقبالیات کی خاطر ایک مبارک کوشش بھی ۔

۱۷- آخری مضمون پچپن مطبوعہ صفحات کا حامل ہے ۔

اختر راہی

علامہ اقبال کا سفرِ افغانستان

۱۹۳۳ء میں شاہِ افغانستان اعلیٰ حضرت نادر شاہ نے بعض مذہبی اور تعلیمی امور کے متعلق مشورے کے لیے بر صغیر کے تین دانشوروں — علامہ اقبال، راس مسعود اور سید سلیمان ندوی — کو افغانستان آنے کی دعوت دی۔ علامہ اقبال کی وساطت سے راس مسعود اور سید سلیمان ندوی کو قونصل جنرل کا باضابطہ دعوت نامہ بھیجا گیا۔ قونصل جنرل کی خواہش تھی کہ یہ تینوں بزرگ ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۳ء کے جشنِ استقلال کے موقع پر کابل پہنچ جائیں، مگر اس قدر جلد پاسپورٹ کا ملنا ممکن نہ تھا اور جب تک پاسپورٹ نہ حاصل ہو جاتا روانگی کی تاریخ کا حتمی تعین نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ جب ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو علامہ صاحب اور راس مسعود کو پاسپورٹ مل گیا تو ۲۰ اکتوبر کو لاہور سے اور ۲۱ اکتوبر کو پشاور سے روانگی کا پروگرام بن گیا۔ علامہ اور راس مسعود اسی پروگرام کے مطابق لاہور سے پشاور روانہ ہوئے اور سفر شروع کر دیا۔ رات "ڈین ہوٹل" میں بسر کی۔ یہ ہوٹل پشاور چھاؤنی کے بالکل قریب ہے۔ سید سلیمان ندوی کے پاسپورٹ ملنے میں دیر تھی، اس لیے وہ پشاور بھی اپنے ساتھیوں سے نہ مل سکے۔ آخر ۲۳ اکتوبر کو لکھنو سے اور ۲۵ کو پشاور سے روانہ ہوئے۔

علامہ نے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے درجِ ذیل اخباری بیان دیا:

"تعلیم یافتہ افغانستان ہندوستان کا بہترین دوست ہوگا۔ کابل میں ایک نئی یونیورسٹی کا قیام اور ہندوستان کے شمال مغربی علاقہ میں اسلامیہ کالج پشاور کو ایک دوسری یونیورسٹی میں تبدیل کرنے کی سکیم ہندوستان اور افغانستان کے درمیانی علاقہ میں بسنے والے ہوشیار افغان قبیلوں کی سدھار میں بہت زیادہ ممد ثابت ہوگی۔

"شاہ افغانستان نے ہمیں اس لیے دعوت دی ہے کہ ہم وہاں وزیرِ تعلیم کو کابل میں یونیورسٹی کے قیام کے سلسلے میں مشورہ دیں۔ اعلیٰ حضرت کی

دعوت کو قبول کرنا ہم نے اپنا فرض سمجھا ۔ کابل سے شائع ہونے والے مختلف جرائد سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کا نوجوان طبقہ نئے علوم کی تحصیل اور اُنھیں اپنے مذہب اور تمدن کے سانچے میں ڈھالنے کا بے حد خواہش مند ہے ۔ افغان لوگ بہت خلیق ہوتے ہیں اور ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم اُن کی زیادہ سے زیادہ امداد کریں ، اور اب یہ امر بالکل واضح ہے کہ افغان لوگوں میں ایک نئی بیداری پیدا ہو رہی ہے اور ہمیں امید واثق ہے کہ ہندوستان کے اندر تعلیمی تجربہ کی روشنی میں ہم اُنھیں تعلیمی مسائل میں مفید مشورہ دے سکیں گے ۔

''میرا اپنا یہ خیال ہے کہ خالص دنیوی تعلیم سے اچھے نتائج پیدا نہیں ہوئے اور خصوصاً اسلامی ممالک میں ۔ مزید برآں کسی طریقۂ تعلیم کو قطعی اور آخری نہیں کہا جا سکتا ۔ ہر ملک کی ضروریات کو خاص طور پر مدِ نظر رکھنا پڑتا ہے ۔''[1]

علامہ اور راس مسعود ۲۳ اکتوبر کو کابل پہنچ گئے تھے ۔ قیام کا انتظام کابل کے نئے حصۂ شہر ''دارالامان'' کے شاہی مہمان خانے میں کیا گیا تھا ۔[2] ۲۶ اکتوبر رات آٹھ بجے سید سلیمان ندوی اپنے ساتھیوں سے آ ملے ۔ راس مسعود صاحب کے ساتھ پروفیسر ہادی حسن بطور سیکرٹری آئے تھے ۔ پروفیسر ہادی حسن نواب محسن الملک مرحوم کے بھتیجے تھے اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں سائنس کے اُستاد تھے ۔ علامہ کے سیکرٹری غلام رسول خان بیرسٹر تھے جو امیر حبیب اللہ کے زمانے میں کابل میں بصیغۂ تعلیمات چند سال رہ چکے تھے ۔

نادر شاہ سے ملاقات ۔ سید سلیمان ندوی کے حلقۂ یاراں میں شامل ہونے سے پہلے تعلیمی مشورت کے لیے چند اجلاس ہوئے جن میں حکومتِ افغانستان کے بعض سرکردہ افراد نے شرکت کی اور ان اجلاسوں میں کارروائی راس مسعود صاحب نے نوٹ کی ۔ نیز علامہ اور راس مسعود کی ملاقات نادر شاہ سے بھی ہوئی ۔ اس ملاقات کے بارے میں ڈاکٹر ظہیرالدین لکھتے ہیں :

''پہلی ملاقات میں مغرب[3] کی نماز کے موقع پر نادر شاہ نے اقبال سے امامت کی درخواست کی ۔ اقبال نے کہا : نادر ، میں نے اپنی عمر کسی شاہِ عادل کی اقتدا میں نماز پڑھنے کی تمنّا میں گزار دی ہے ۔ آج جب کہ خدا نے فقیر کی اس مراد کے پورا کرنے کے اسباب مہیا کر دیے ہیں تو کیا تو مجھے

۱۔ ''حرفِ اقبال'' ، ص ۲۳۰ ۔ ۲۔ ''اقبالِ کامل'' ، ص ۳۳ ۔

۳۔ ''عصر'' درست ہے — اختر ۔

اس نعمت سے محروم کرنا چاہتا ہے ؟ آج میں تیری اقتدا میں نماز پڑھوں گا ۔ امامت تجھ کو کرنی ہوگی ۔''[۴]

علامہ نے مثنوی ''مسافر'' میں اس ملاقات کا ذکر نہایت پُر اثر طریقے سے کیا ہے :

قصرِ سلطانی کہ نامش دلکشاست — زائران را گردِ راہش کیمیاست
شاہ را دیدم در آن کاخِ بلند — پیشِ سلطانے فقیرے دردمند !
خُلقِ او اقلیمِ دلہا را کشود — رسم و آئینِ ملوک آنجا نہ بود
من حضورِ آن شہِ والا گہر — بے نوا مردے بدر بارِ عمر
جانم از سوزِ کلامش در گداز — دستِ او بوسیدم از راہِ نیاز
پادشاہے خوش کلام و سادہ پوش — سخت کوش و نرم خوے و گرم جوش
صدق و اخلاص از نگاہش آشکار — دین و دولت از وجودش استوار
خاکی و از نوریان پاکیزہ تر — از مقامِ فقر و شاہی با خبر
در نگاہش روزگارِ شرق و غرب — حکمتِ او رازدارِ شرق و غرب
شہریارے چون حکیمان نکتہ دان — رازدانِ مد و جزرِ اُمتان
پردہ ہا از طلعتِ معنی کشود — نکتہ ہائے ملک و دین را وا نمود
گفت ازان آتش کہ داری در بدن — من ترا دانم عزیزِ خویشتن
ہر کہ اُو را از محبت رنگ و بوست — در نگاہم ہاشم و محمود اوست
در حضورِ آن مسلمانِ کریم ! — ہدیہ آوردم ز قرآنِ عظیم
گفتم این سرمایۂ اہلِ حق است — در ضمیرِ اُو حیاتِ مطلق است
اندر و ہر ابتدا را انتہا است — حیدر از نیروئے او خیبر کشا است
نشۂ حرفم بخونِ اُو دوید — دانہ دانہ اشک از چشمش چکید
گفت ''نادر در جہان بے چارہ بود — از غمِ دین و وطن آوارہ بود
کوہ و دشت از اضطرابم بے خبر — از غمانِ بے حسابم بے خبر
نالہ ہا بانگِ ہزار آمیختم — اشک ہا جوئے بہار آمیختم
غیرِ قرآن غمگسارِ من نہ بود
قوتش ہر باب را بر من کشود''
گفتگوئے خسروِ والا نژاد — باز با من جذبۂ سرشار داد
وقتِ عصر آمد صدائے الصلوٰت — آن کہ مومن را کند پاک از جہات
انتہائے عاشقان سوز و گداز — کردم اندر اقتدائے اُو نماز

۴۔ ''اقبال کی کہانی''، ص ۹۶ - ۹۷ -

راز ہائے آن قیام و آن سجود
جز ببزمِ محرمان نتوان کشود[5]

عشائیے میں شرکت ۔ ۲۶ اکتوبر کو سردار ہاشم خان صدرِ اعظم نے مہمانوں کے اعزاز میں عشائیے کا اہتمام کیا ۔ عشائیے میں افغانستان کے سربرآوردہ افراد ، وزرا اور فوجی افسران شریک تھے ۔ سردار ہاشم خان سے مہمانوں کا تعارف سردار فیض محمد خان (وزیر خارجہ) نے کرایا ۔ اس کے بعد سردار ہاشم خان مہمانوں کو لے کر کھانے کے کمرے میں گئے ۔ کھانا میزوں پر تھا اور ہر چیز یورپی طریقے کے مطابق آراستہ تھی ۔ کھانا کھانے اور کھلانے کا طریق اور ملازموں کا ادب و سلیقہ ہر چیز یورپ کے تمدنِ جدید کے مطابق تھی ۔ علامہ اقبالؒ کے بقول ''ہم کو تعجب ہو رہا تھا کہ آیا ہم افغانستان کے شہر کابل میں ہیں یا تمدنِ جدید کی نئی دلی میں ۔''[6]

کھانے کے میز پر تبادلۂ خیال شروع ہوا ۔ سید سلیمان ندوی نے افغانستان میں اشاعتِ اسلام کے بارے میں گفتگو کی ۔ راس مسعود نے اپنے سفرِ جاپان کے پُر لطف تاثرات اور واقعات بیان کیے اور علامہ نے فلسفہ و سیاست کے بعض نکات آسان اور دوستانہ انداز میں واضح کیے ۔

کھانے سے فارغ ہو کر ملاقات کے پہلے کمرے میں مہمان جمع ہوئے ۔ چائے سگریٹ سے تواضع کی گئی ۔ سردار ہاشم خان (میزبان) نے دریافت کیا کہ گانا سننے میں تو کوئی حرج نہیں ! سید صاحب نے کہا : بلا ساز کوئی مضائقہ نہیں ۔ وہ شاید ساز کا لفظ نہ سمجھے ۔ کہنے لگے : ہمارے ہاں رنڈی منڈی نہیں ہوتی ۔ مرد گاتے ہیں ۔ علامہ نے تائید کی ۔ گویے آئے ۔ بیدل اور حافظ کی غزلوں سے فردوسِ گوش کا سماں پیدا کیا ۔

نمازِ جمعہ ۔ ۲۷ اکتوبر جمعہ کا دن تھا ۔ بادشاہ شہر کی مختلف مسجدوں میں باری باری جمعہ کی نماز ادا کرتے تھے ۔ اس روز شہر کی سب سے بڑی مسجد ''پُل خشتی'' میں نماز پڑھنے والے تھے ۔ علامہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ نماز ادا کرنے مسجد پُل خشتی گئے ۔ مسجد میں بادشاہ کے لیے مقصورہ بنا ہوا تھا ۔ مہمانوں کو بھی مقصورہ میں جگہ دی گئی ۔ نماز جمعہ سے واپسی پر علامہ اور سید صاحب کے ساتھ ایک ذمہ دار شخص بھی تھے ۔ ان سے چینی ترکستان کے واقعات کی نسبت گفتگو ہوتی رہی ۔ علامہ نے دورانِ گفتگو فرمایا :

۵- مثنوی "مسافر''، ص ۱۳ - ۱۵ ۔
۶- ''سیرِ افغانستان''، ص ۳۲ ۔

''یورپ نے اپنی اس نئی ترقی میں سارا زور بحری طاقت پر صرف کیا اور ہر قسم کی تجارتی آمد و رفت اور سیر و سیاحت کے راستے دریائی رکھے اور اپنے انہی جہازوں کے ذریعہ سے مشرق کو مغرب سے ملا دیا ۔ لیکن اب یہ نظر آ رہا ہے کہ ان بحری راستوں کی یہ حیثیت جلد فنا ہو جائے گی ۔ اب آئندہ مشرق وسطیٰ کا راستہ مشرق و مغرب کو ملائے گا اور تری کے بجائے خشکی کا راستہ اہمیت حاصل کرے گا ۔ تجارتی قافلے اب موٹروں ، لاریوں ، ہوائی جہازوں اور ریلوں کے ذریعے مشرق و مغرب میں آئیں جائیں گے اور چونکہ یہ پورا راستہ اسلامی ملکوں سے ہو کر گزرے گا ، اس لیے اس انقلاب سے ان اسلامی ملکوں میں عظیم الشان اقتصادی و سیاسی انقلاب رونما ہوگا ۔''[۷]

واپس دارالامان (مہمان خانہ) آ کر کھانا تناول کیا اور ''نورالمشائخ'' سے ملاقات کا پروگرام بنایا ۔

نورالمشائخ سے ملاقات : افغانستان کی سیاست میں شروع سے علما کو خاصا عمل دخل حاصل رہا ہے اور علما میں مجددی سلسلے کے روحانی پیشوا مثلاً شور بازار نورالمشائخ کا مرتبہ سب سے بلند تھا ۔ ''نورالمشائخ'' کا اصل نام فضل عمر تھا ۔ اُن کے مریدوں کی تعداد لاکھوں میں تھی ۔ ۱۹۱۸ کی جنگِ افغانستان میں وہ جنرل نادر خان کے ساتھ شریکِ جہاد تھے اور اُن کی تقاریر سے قبائلی مسلمان جوق در جوق لشکر میں شامل ہوئے تھے ۔

برصغیر میں بھی اُن کے خاصے مرید تھے ۔ جب امان اللہ خان نے اصلاحات میں حدِ اعتدال سے تجاوز کیا تو اُس سے ناراض ہو کر یہاں آ گئے تھے ۔ بچہ سقہ کے پورے دور میں وہ برصغیر میں رہے ۔ نادر خان کی کامیابی پر واپس وطن گئے تھے ۔ حکومت نے خیر مقدم کیا اور وزیرِ عدالت مقرر کر دیا ۔ کچھ عرصے تک وزارتِ عدل کا فریضہ انجام دیا مگر اپنی درویشی اور طریقۂ ارشاد کے خلاف سمجھ کر عہدے سے دستکش ہو گئے ۔

علامہ نے نورالمشائخ سے اُن کی قیام گاہ پر ملاقات کی ۔ وہ علامہ سے لاہور میں مل چکے تھے ۔ سید صاحب نے گفتگو میں خوب حصہ لیا ۔ برصغیر کے حالات اور بچہ سقہ کے دور پر بات چیت رہی ۔ چائے نوشی کے بعد علامہ نے اجازت لی ۔

کو نورالمشائخ نے خشک میوے بطورِ تحفہ دیے اور پُر لطف گفتگو کے بعد

ہندوستانی پارٹی : افغانستان میں مقیم برصغیر کے باشندوں نے اپنے ہم وطن

۷- ایضاً ۔

دانشوروں کے اکرام میں کھانے کا انتظام کیا ۔ اللہ نواز خان[۸] کے ہاں دعوت کا اہتمام تھا ۔ مدعوئین میں سردار فیض محمد (وزیر خارجہ) ، مولانا سیف الرحمان ، مولانا محمد میاں منصور انصاری (مؤلف ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' و سیکرٹری جمعیت علمائے ہند) اور مولانا محمد بشیر (صدر جماعت مجاہدین ، جن کا مرکز چمرقند تھا) نمایاں تھے ۔

دعوت باغ میں تھی ۔ کسی نے باغ کا فوارہ کھول دیا ۔ راس مسعود مبتلائے زکام تھے ۔ اُن کے کہنے پر بند کرنا پڑا ۔ اس موقع پر سردار فیض محمد خان نے مہمانوں کی طرف اشارہ کرکے برجستہ یہ شعر پڑھا :

گوہر شہوار می سازد نثارِ قدمت
''ورنہ از فوارہ مقصود دگر کے دارد آب''

مصرعہ اوّلین تو کسی شاعر کا ہے مگر دوسرے مصرعے نے جو خود سردار صاحب کی بدیہہ گوئی کا نتیجہ تھا محفل میں ہلکی سی مسکراہٹ پیدا کر دی ۔

علامہ نے دوستوں کے اصرار پر پہلا مصرعہ بدل کر جواب دے دیا ۔ افسوس کہ سید سلیمان صاحب کو پورا مصرعہ یاد نہیں ۔ کچھ یوں تھا :

۔ ۔ ۔ می شمارد قدرِ احسان شما
ورنہ از فوارہ مقصود دگر کے دارد آب

چائے سے فارغ ہوکر حاضرین کا گروپ فوٹو لیا گیا ۔ اس کے بعد مولانا محمد بشیر نے مہمانوں کو خیر مقدم کہا جس میں ان دانشوروں کو افغانستان بلانے پر حکومت کا شکریہ ادا کیا ۔ مہمانوں کی طرف سے سید سلیمان ندوی مرحوم نے جوابی تقریر کی ۔ علامہ نے بھی مختصر خطاب کیا ۔

سید سلیمان ندوی کابل میں چند روز ٹھہر کر پشاور کے راستے ہی واپس آنا چاہتے تھے مگر علامہ سرزمین غزنی کی زیارت کا شوق رکھتے تھے ۔ اس لیے واپسی غزنین ، قندھار اور چمن کے راستے ہوئی ۔

صدرِ اعظم سردار محمد ہاشم سے ملاقات : اگلے روز ۲۸ اکتوبر کو سردار محمد ہاشم مہمانوں سے ملاقات کے لیے اُن کی قیام گاہ آئے ۔ دیر تک گفتگو رہی ۔

۸۔ جنگِ عظیم اوّل کے زمانے میں اسلامیہ کالج لاہور کے گیارہ طالب علم سرحد پار چلے گئے تھے ۔ ان میں سے ایک اللہ نواز خان تھے ۔ اُن کا خاندان ملتان میں آباد تھا ۔ بچہ سقہ سے نجات حاصل کرنے میں انہوں نے نادر خان کی مدد کی تھی ۔

راس مسعود صاحب نے ملک میں معدنیات کی ترقی اور سڑکوں کی تعمیر پر زور دیا اور فرمایا کہ معدنیات سے اُن کا مقصود جواہرات اور ہیروں کی کانوں کی دریافت اور ترقی نہیں ۔ ان چیزوں کی قدر و قیمت اب پہلے جیسی نہیں رہی ۔ بلکہ اُن کا مقصود مختلف دھاتوں اور خصوصاً پٹرولیم کی دریافت اور جستجو سے ہے جس کی کثیر مقدار ان پہاڑوں اور وادیوں کے اندر معلوم ہوتی ہے ۔

سردار محمد ہاشم خان (صدر اعظم) نے ترقیاتی پروگراموں پر روشنی ڈالی ۔ علامہ نے بھی سڑکوں کی تعمیر پر زور دیا اور آئندہ مستقبل میں مشرق وسطیٰ اور افغانستان کی جغرافیائی اہمیت واضح کی ۔ صدر اعظم نے مہمانوں کے ساتھ کھانا کھایا اور تین بجے رخصت ہوئے ۔

شاہ محمود خان وزیر جنگ کی دعوتِ چائے ۔ چار بجے شام وزیر جنگ شاہ محمود خان کے ہاں چائے کی دعوت تھی جس میں چیدہ افراد نے شرکت کی ۔ سات بجے تک اسی دعوت میں وقت گزرا اور افغانستان کے حالات پر گفتگو ہوتی رہی ۔

انجمن ادبی کی دعوت ۔ ساڑھے سات بجے شب انجمن ادبی کابل کی طرف سے دعوتِ شب (ڈنر) طے شدہ تھی ۔ کابل ہوٹل میں انجمن سے منسلک ادیب جمع ہوئے ۔ شہزادہ علی احمد خان درانی ، جو اسلامیہ کالج لاہور کے تعلیم یافتہ اور سیکرٹریٹ افغانستان کے ایک معزز عہدے دار تھے ، اس انجمن کے سیکرٹری اور روحِ رواں تھے ۔ انجمن ایک ماہانہ مجلہ ''کابل'' شائع کرتی تھی ۔ اسی مجلہ میں علامہ کے دورانِ قیامِ افغانستان میں مندرجہ ذیل نظم (یا غزل) بعنوان ''پیام اقبال بملت کوہسار'' شائع ہوئی تھی ۔

صبا بگوئے بافغان کوہسار از من
بمنزلے رسد آن ملتے کہ خود نگر است
مریدِ پیر خراباتیان خودبین ، شو
نگہِ او ز عقابِ گرسنہ تیز تر است
ضمیر تست کہ نقشِ زمانہ تو کشد
نہ حرکتِ فلک است این ، نہ گردش قمر است
دگر بسلسلۂ کوہسار خود بنگر !
کہ تو کلیمی و صبح تجلی دگر است
بیا بیا کہ بدامانِ نادر آویزیم
کہ مرد پاک نہاد است و صاحبِ نظر است

یکے است ضربتِ اقبال و ضربتِ فرہاد
جز این کہ تیشۂ ما را نشانہ بر جگر است۹

انجمن کے صدر نشین نے مہمانوں کو خیر مقدم (بزبان فارسی) کہا ۔ خیر مقدمی ایڈریس میں مہمانوں کی آمد پر اظہارِ مسرت کیا گیا تھا ۔ علامہ کی علمی خدمات کے تذکرے میں تھا :

''حضرتِ اقبال کے قیمتی آثار و تالیفات جن میں سے ہر ایک نے اخلاق ، سعی و عمل ، اجتماع ، جذباتِ شرق دوستی اور احساساتِ اسلام پرستی کی اہلِ ایشیا کے جسموں میں روح پھونکی ہے ۔''۱۰

خیر مقدم کے بعد افغانستان کے مشہور شاعر جناب قاری عبداللہ خان نے مہمانوں کے اعزاز میں نظم پڑھی ۔ علامہ سے متعلق اشعار درج ہیں :

عزیزان ز ہندوستان آمدند	در افغانستان میہمان آمدند
در آنان یکے ڈاکٹر اقبال ہند	سخن پرور و واقفِ حالِ ہند
ادیبِ سخن گستر نکتہ سنج	کہ ہر نکتہ اش بہتر آمد ز گنج
چمن گردۂ طرزِ رنگین اوست	شکر پارۂ حرف شیرینِ اوست
کلامش چو اوج بلندی گرفت	سخن رتبۂ ارجمندی گرفت
زند طعنہ آہنگ او برق را	کہ خواہان بود نہضتِ شرق را
نوین شیوۂ را بہ سبکِ کہن	در آمیخت از قدرت علم و فن
چو اندر سخن جادۂ نوگزید	پیامش ز مشرق بہ مغرب رسید
سخن را در آمیخت چون با علوم	ازو زندہ شد طرزِ مولائے روم
جوفکرش پئے فیلسوفی گرفت	طرازِ سخن طرزِ صوفی گرفت
نوایش ہم آہنگ با نفخِ صور	کہ افسردگان را در آرد بشور
جو بلبل بآہنگ کہسارِ ما	ز ہند آمد این طوطی خوشنوا

نظم کے بعد مہمانوں کی طرف سے پروفیسر ہادی حسن ، سر راس مسعود اور علامہ سید سلیمان ندوی نے تقریریں کیں ۔ سب سے آخر میں ڈاکٹر صاحب نے مندرجہ ذیل تقریر کی جو اس موقع پر بہت پُراثر ثابت ہوئی :

''اگرچہ سر راس مسعود اور سید سلیمان ندوی کی تقریروں کے بعد اب

۹۔ ''اسلامی تعلیم'' ، اقبال نمبر ، ص ۴ ۔
۱۰۔ ''سیر افغانستان'' ، ص ۶۸ ۔

کوئی چیز ایسی باقی نہیں ہے جسے میں بیان کروں لیکن انجمن ادبی کابل کے ارکان مجھ سے بھی توقع رکھتے ہوں گے کہ خیر مقدم کے جواب میں میں بھی کچھ عرض کروں ۔ میں انجمن کا بہت ممنون ہوں کہ اس نے میرے متعلق نظم و نثر میں بہت اچھے خیالات اور پُراحساس جذبات ظاہر کیے ہیں ۔

"میں بھی خواہش رکھتا ہوں کہ انجمن کے نوجوان ارکان کے عملی پہلو سے بحث کروں ۔ میرا عقیدہ ہے کہ آرٹ یعنی ادبیات یا شاعری یا مصوّری یا موسیقی یا معماری ان میں سے ہر ایک زندگی کی معاون اور خدمت گار ہے ۔ اس بنا پر میں آرٹ کو ایجاد و اختراع سمجھتا ہوں نہ کہ محض آلۂ تفریح ۔ شاعر قوم کی زندگی کی بنیاد کو آباد بھی کر سکتا ہے اور برباد بھی ۔ اس وقت جب کہ حکومت یہ کوشش کر رہی ہے کہ موجودہ زمانہ میں افغانستان کی تاریخ ایک نئی زندگی کے میدان میں داخل ہو تو اس ملک کے شعرا پر لازم ہے کہ وہ نوجوان قوم کے سچے رہنما بنیں ۔ زندگی کی عظمت اور بزرگی کی بجائے موت کو زیادہ بڑھا کر نہ دکھائیں کیونکہ جب آرٹ موت کا نقشہ کھینچتا ہے اور اس کو بڑھا چڑھا کر دکھاتا ہے اُس وقت وہ سخت خوف ناک اور برباد کُن ہو جاتا ہے اور جو حسن قوت سے خالی ہو وہ محض پیامِ موت ہے :

دل بری بے قاہری جادوگری است   دل بری با قاہری پیغمبری است

''میں چاہتا ہوں کہ آپ کی توجہ کو ایک مرکزی نقطہ کی طرف مبذول کروں ۔ حیاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات میں سے ایک واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں عرب کے مشہور شاعر امراء القیس کے کچھ اشعار پڑھے گئے ۔ ارشاد ہوا ، 'اشعر الشعراء و قائدھم الی النار' یعنی تمام شاعروں میں بہترین شاعر اور اُن کو دوزخ کی طرف لے جانے والا ۔

''اس ارشادِ سراسر رشاد سے واضح ہے کہ شعر کا کمال بعض اوقات لوگوں پر بُرا اثر مرتب کرتا ہے ۔ کسی قوم کی زندگی موقوف علیہ و چیزیں محض شکل و صورت نہیں ہیں ۔ بلکہ جو چیز حقیقتاً قوم کی زندگی کے ساتھ تعلق رکھتی ہے وہ 'تخیل' ہے جس کو شاعر قوم کے سامنے پیش کرتا ہے اور وہ بلند نظریات ہیں جن کو وہ اپنی قوم میں پیدا کرنا چاہتا ہے ۔ قومیں شعرا کی دستگیری سے پیدا ہوتی ہیں اور اہلِ سیاست کی پامردی سے نشو و نما پا کر مر جاتی ہیں ۔ پس میری خواہش ہے کہ افغانستان کے شعرا اور انشاپرداز اپنے ہم عصروں میں ایسی روح پھونکیں جس سے وہ اپنے آپ کو پہچان سکیں ۔ جو قوم ترقی کے راستے پر چل رہی ہے اُس کی انانیت خاص تربیت کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے ــ مگر وہ تربیت جس کا خمیر احتیاط کے ساتھ اُٹھایا جائے ۔ پس اس انجمن کا کام یہ ہے کہ نوجوانوں کے افکار کو ادبیات کے ذریعہ سے متشکل کرے اور ان کو ایسی روحانی صحت بخشے کہ وہ بالآخر اپنی خودی کو پا کر اور

قابلیت بہم پہنچا کر پکار اُٹھیں :

دو دستہ تیغم و گردون برہنہ ساخت مرا
فسان کشیدہ بروئے زمانہ آفت مرا
من آن جہان خیالم کہ فطرتِ ازلی !
جہان بلبل و گل را شکست و ساخت مرا
نفس بہ سینہ گدازم کہ طائر حرمم
توان ز گرمیٔ آواز من شناخت مرا

میں ایک نکتہ اور بھی کہنا چاہتا ہوں ۔ مسولینی نے ایک اچھا نظریہ قائم کیا ہے کہ اٹلی کو چاہیے کہ اپنی نجات حاصل کرنے کے لیے ایک کروڑپتی کو پیدا کرے جو اس ملک کے گریبان کو اینگلوسیکن (Anglo-Saxon) اقوام کے قرضے سے نجات دلا سکے ، یا کسی دوسرے دانتے (Dante) کو پیدا کرے جو نئی جنت پیش کرے ، یا کسی نئے کولمبس (Colombus) کو پیدا کرے جو ایک نئے برّاعظم کا پتہ لگائے ۔ اگر آپ مجھ سے دریافت کریں تو میں کہوں گا کہ افغانستان کو ایک ایسے مرد کی ضرورت ہے جو اس ملک کو قبائلی زندگی سے نکال کر وحدتِ ملّی کی زندگی سے آشنا کرسکے اور مجھے خوشی ہے کہ افغانستان کو ایک ایسا مردِ کامل مل گیا ہے جس کا وہ عرصے سے انتظار کر رہا تھا اور مجھے یقین ہے کہ اعلیٰ حضرت نادر شاہ کی شخصیت کو اسی لیے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ افغانستان کو ایشیا میں ایک نئی قوم بنا کر دنیا سے متعارف کریں ۔ اس ملک کے نوجوانوں کو چاہیے کہ اس بزرگ راہنما کو اپنی تعلیم و تربیت کا معلّم سمجھیں کیونکہ ان کی زندگی ایثار ، اخلاص اور اپنے ملک کے ساتھ صداقت اور اسلام کے ساتھ عشق و محبت سے لبریز ہے ۔"[11]

پُرلطف علمی تقریروں کے بعد کھانا کھایا گیا ۔ کچھ دیر تبادلۂ خیالات ہوتا رہا ۔ علامہ کا دل پسند حقہ رفیقِ سفر تھا ۔ علامہ گفتگو کے ساتھ ساتھ حقہ بھی گڑگڑاتے رہے ۔ رات دس بجے قیام گاہ واپس آئے ۔

۲۹ اکتوبر کو سردار احمد خان وزیرِ دربار کی دعوت پر شام تین بجے پغمان جانے کا پروگرام تھا ۔ علامہ کو نادر شاہ سے آخری ملاقات بھی کرنا تھی ۔ اس لیے پغمان جانے کا پروگرام ملتوی کر دیا ۔ وہ شام کو وزیرِ خارجہ سردار فیض محمد خان کے ساتھ شاہ سے ملنے اُن کی رہائش گاہ "دلکشا" گئے ۔

رات مختلف حضرات ملاقات کی غرض سے آئے ۔ مولوی محمد بشیر صاحب ،

۱۱- "سیر افغانستان" و "مقالات اقبال" (مرتّبہ معینی) ۔

صدر ، جمعیت مجاہدین ، مولانا محمد میاں ، منشی میر شمس الدین (سابق ناظم ، انجمن حمایت اسلام ، لاہور) ان میں ممتاز تھے ۔

۳۰ اکتوبر کو صبح آٹھ بجے غزنین کے لیے روانہ ہوئے ۔ حکومت افغانستان نے مہمانوں کے با سہولت سفر کا پورا اہتمام کیا تھا ۔ متوقع قیام گاہوں میں پہلے سے پیغام بھجوا دیے گئے تھے اور بطور میزبان سرور خان گویا ساتھ تھے ۔ سواری اور باربرداری کے لیے دو موٹریں اور دو لاریاں دی گئیں تھیں ۔ ایک موٹر میں علامہ اقبال ، سید سلیمان ندوی اور بیرسٹر غلام رسول تھے اور دوسری میں پروفیسر ہادی حسن ، سرور خان گویا اور عبد المجید (نمائندہ سفارت خانہ افغانستان ، دہلی) تھے ۔ ایک لاری کھانے کے سامان اور کھانا پکانے اور کھلانے والے ملازمین کے لیے تھی ۔ دوسری لاری پر مہمانوں کا سامان لدا تھا ۔ اس قافلے میں اعزاز اور حفاظت کی غرض سے دس بارہ سپاہیوں کا دستہ بھی شامل تھا ۔

غزنیں کابل سے بیاسی میل ہے ۔ موٹریں دشت و جبل اور نشیب و فراز طے کرتی ایک بجے غزنین پہنچ گئیں ۔ مہمانوں نے پہلے بازار کی سیر کی اور پھر قیام گاہ آ کر کھانا تناول کیا ۔

غزنیں کے آثار قدیمہ کی سیر کے لیے افسر مہمان دار سرور خان گویا نے ایک پیر فرتوت 'ملا قربان کو بلایا ۔ یہ صاحب نوے سال کی عمر کے تھے اور غزنیں کے گوشے گوشے سے آگاہ ۔ موجودہ شہر سے کئی میل ہٹ کر قدیم شہر کے نشانات ہیں جو سلاطین غزنیں کا پایۂ تخت تھا ۔ اس مقام کے مخالف سمت شہر کی دوسری طرف پرانا قبرستان ہے جہاں بیسیوں عہد ساز ہستیاں محو خواب ہیں ۔

فاتحہ بر مزارات حکیم سنائی و سلطان محمود ۔ علامہ سنائی کے مزار پر حاضر ہونے کا اشتیاق رکھتے تھے ۔ اس لیے سب سے پہلے مہمان خانہ سے پیدل مزار گئے اور مسنون دعا پڑھی ۔ یہاں تمام حاضرین متاثر تھے ۔ ''سب سے زیادہ ڈاکٹر اقبال پر اثر تھا ۔ وہ حکیم ممدوح کے مزار پر کھڑے ہو کر بے اختیار ہو گئے اور دیر تک زور زور سے روتے رہے ۔''[۱۲]

دوسرے چشم دید گواہ سرور گویا لکھتے ہیں : ''حکیم سنائی کی قبر پر اُس [علامہ] نے اتنے آنسوؤں کا پانی چھڑکا کہ وہاں کے پتھر موم ہو گئے۔''[۱۳]

۱۲- ''سیر افغانستان'' ۔
۱۳- ''مقالات یوم اقبال'' (۱۹٦۷) ، ص ۳٦ ۔

یہاں سے فارغ ہوکر سلطان محمود غزنوی کے مزار پر فاتحہ کے لیے قافلہ چلا ۔ بروایت گویا ''سلطان محمود کے روضے کی ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہی علامہ نے اپنا سر فرطِ احترام سے جھکا لیا تھا۔''[۱۴]

حضرت علی ہجویری (داتا گنج بخش) کے والد کا مزار ۔ سلطان محمود غزنوی کے مزار سے واپس آتے ہوئے علامہ کو لاہور کی مناسبت سے حضرت داتا گنج بخش کے والد بزرگوار کے مزار کی تلاش ہوئی ۔ چنانچہ اُن کی ہدایت کے مطابق مُلا قربان نے قدیم ویرانوں میں قبر تلاش کی اور جملہ حضرات نے دعائے مسنونہ پڑھ کر گھر کا راستہ لیا ۔ سرور گویا اس روز کے تاثرات کو ان الفاظ میں سمیٹتے ہیں :

''جب ہم ان مقدس اور پُر جلال مقامات پر پہنچے ہیں تو ہم تو دعا میں مشغول تھے لیکن شاعر اسلام کو ہم نے وہاں دیکھا کہ وہ ایک بے جان تصویر کی طرح کھڑا ہے اور آنسوؤں کا دریا اُس کی آنکھوں سے اُمڈ رہا ہے ۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر ہم میں بھی یارائے ضبط نہ رہا۔''[۱۵]

۳۱ اکتوبر کو آٹھ بجے صبح غزنین سے آگے روانہ ہوئے اور گیارہ بجے دوپہر مُقر پہنچے ۔ راستہ بہت صاف اور ہموار تھا ۔ مُقر میں سرکاری افسروں کو مہمانوں کے آنے کی طلاع تھی ۔ جیسے ہی موٹریں آکر رکیں ، گارڈ آف آنر نے سلامی دی ۔ ایک دو منزلہ عمارت میں قیام و طعام کا انتظام تھا ۔ دوپہر کا کھانا یہاں کھانے کے بعد ایک بجے قلات کا رخ کیا ۔ تین گھنٹے میں قلات غلزئی پہنچ گئے ۔ مہمان خانہ کھلے میدان میں واقع تھا اور آس پاس کوئی آبادی نہ تھی ۔ قلات غزنین سے ایک ہزار فٹ اور کابل سے دو ہزار فٹ بلند ہے ۔ اس لیے قدرتی طور پر ٹھنڈک زیادہ تھی ۔ رات قلات کے مہمان خانہ میں کٹی ۔

یکم نومبر کو صبح سویرے تمام افراد اُٹھے ۔ ناشتہ کرنے کے بعد آٹھ بجے سفر شروع کیا گیا ۔ چار گھنٹے میں قندہار پہنچ گئے ۔ شاہی قیام گہ میں ٹھہرنے کا پروگرام تھا ۔

عبدالحئی خان سے ملاقات ۔ مہمانوں کی آمد پر شہر کے ممتاز افراد ملاقات کے لیے آئے جن میں وزارتِ خارجہ افغانستان کا نمائندہ متعینہ قندہار اور یہاں کی ادبی انجمن کے ناظم عبدالحئی خان بھی شامل تھے ۔ عبدالحئی خان ایک پشتو رسالہ ''افغان'' کے مدیر بھی تھے ۔ وہ کچھ عرصہ کراچی میں مقیم رہے

۱۴- ایضاً ۔

۱۵- ایضاً ، ص ۳۷ ۔

تھے ، اس لیے اُردو اچھی بول لیتے تھے ۔ ان کی ادبی انجمن اور رسالہ "افغان" پشتو زبان کو سرکاری اور تعلیمی زبان بنانے کی تحریک کے علمبردار تھے ۔[۱۶] اُنھوں نے آتے ہی علامہ اقبال سے اس موضوع پر گفتگو شروع کر دی ۔ علامہ نے جواب میں زبانوں کی نشو و نما اور ترقی پر اصولی بحث فرمائی اور اس بات پر زور دیا کہ زبان ایک قوم کے مختلف افراد کی باہم پیوستگی کا سب سے ضروری اور مؤثر ذریعہ ہے ۔ لیکن اگر اس تحریک سے قوم کے افراد میں اتحاد کے بجائے اختلاف رونما ہونے کا اندیشہ ہو تو وہ پیوستگی کا پیغام ہونے کی جگہ نزاعات اور اختلافات کا ترانۂ جنگ ہے جس سے افغان قوم کو موجودہ منزل میں بہت کچھ بچنا چاہیے ۔[۱۷]

ابھی علامہ عبدالحیٔ خاں سے باتیں کر رہے تھے کہ قندہار کے گورنر تشریف لائے ۔ اُن سے بھی کچھ دیر باہم دلچسپی کی گفتگو رہی ۔

زیارت خرقہ شریف ۔ مہمان خانے کے قریب ہی خرقہ شریف کی زیارت اور احمد شاہ درانی کا مقبرہ تھا ۔ ان مقامات کی زیارت کے لیے علامہ اور دوسرے افراد پیدل روانہ ہوئے ۔ البتہ واپسی کے لیے موٹروں کو مقبرے کے دروازے پر پہنچ جانے کا حکم دیا گیا ۔ پہلے خرقہ شریف کی زیارت کی ۔ مشہور ہے کہ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ملبوسِ اقدس ہے ۔ مثنوی "مسافر" میں علامہ لکھتے ہیں :

خرقۂ آن "برزخ لا یبغیان"[۱۸] دیدمش در نکتۂ "لی خرقتان"[۱۹]

مقبرہ احمد شاہ ابدالی ۔ خرقہ شریف کی زیارت کے بعد جنگ پانی پت کے ہیرو احمد شاہ ابدالی کے مقبرے پر مسنون دعا پڑھ کر سڑک پر آئے تو موٹریں

۱۶- آج کل کے افغانستان میں پشتو اور فارسی دونوں زبانیں ذریعۂ تعلیم ہیں ۔ پچھتر فی صد آبادی یہی دو زبانیں بولتی ہے ۔ پشتو پٹھانوں کی مادری زبان ہے اور افغانستان کے مشرقی و جنوب مشرقی علاقوں میں جلال آباد سے قندہار تک بولی جاتی ہے ۔ ۱۹۳۶ میں ایک شاہی فرمان کے ذریعے اسے قومی زبان کا درجہ دیا گیا ۔ پشتو اکیڈمی (پشتو ٹولنہ) کے ذریعے پشتو زبان کی خوب ترویج و ترقی ہوئی ۔

۱۷- "سیر افغانستان" ، ص ۱۴۹ ۔

۱۸- تلمیح بآیت قرآن (سورہ الرحمٰن) ۔

۱۹- نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے : "لی خرقتان الفقر والجہاد" (میرے دو خرقے ہیں ، ایک فقر اور دوسرا جہاد) ۔

موجود تھیں ۔ یہاں سے قندہار کے سب سے خوب صورت اور دل کش طبعی منظر ارغنداب کی سیر کو روانہ ہوئے ۔

ارغنداب ۔ ارغنداب کی سیر کرتے ہوئے بابا ولی قندہاری کے مزار پر فاتحہ پڑھی ۔ واپسی پر ''چہل زینہ'' گئے ۔ یہ ایک پہاڑی ہے جس کی چوٹی پر بابر نے اپنی ہندی فتوحات کا کتبہ لگایا ہے ۔ پہاڑی کے دامن سے اوپر تک پتھر کاٹ کر زینے بنائے گئے ہیں جن کی تعداد چالیس مشہور ہے ۔ اس لیے اس پہاڑی کا نام ''چہل زینہ'' پڑ گیا ہے ۔ علامہ پہاڑی پر نہ چڑھے البتہ سید صاحب اور پروفیسر ہادی نے اپنے تاریخی ذوق کی تسکین کے لیے پہاڑی سر کی ۔

خان بہادر سید صدیق حسن سے ملاقات ۔ راس مسعود کو واپسی کی سخت جلدی تھی ۔ وہ رات کو رخصت ہو کر چمن پہنچنا چاہتے تھے تاکہ وہ جلدی علی گڑھ پہنچ جائیں ۔ قندہار میں حکومتِ برطانیہ ہند کی طرف سے قونصل خانہ تھا ۔ قونصل علامہ کے دوست سید غلام بھیک نیرنگ کے حقیقی بھائی خان بہادر سید صدیق حسن تھے ۔ علامہ سے اُن کی پرانی ملاقات تھی ۔ خان بہادر صاحب نے راس مسعود صاحب کی ہر ممکن مدد کی اور اس طرح قافلے کی ''متاع گران بہا'' رات سفر پر روانہ ہوگئے ۔ باقی رفقا نے رات قندہار میں بسر کی ۔

۲ نومبر کو آٹھ بجے صبح چائے اور ناشتہ سے فارغ ہوئے ۔ گورنر قندہار نے مہمانوں کو کچھ خشک میوے اور قندہاری اناروں کے دو ٹوکرے تحفہ بھیجے اور قافلہ چل پڑا اور بارہ بجے قلعہ جدید پہنچ گیا ۔ یہ افغانستان کی آخری چوکی ہے ۔ یہاں گویا اور دوسرے شاہی ملازمین نے علامہ اور اُن کے ساتھیوں کو الوداع کہی ۔

چمن ۔ چمن شہر کے دروازے پر مسلمانان شہر نے استقبال کیا اور ایک ریستوران میں چائے کا اہتمام کیا ۔ اہالیان شہر کی خواہش تھی کہ علامہ اور سید صاحب اپنے سفر ملتوی کر کے یہاں کے مسلمانوں کے سامنے تقاریر کریں مگر ہر دو حضرات نے معذرت کر دی ۔

ریستوران میں مختلف خیال کے مسلمان جمع ہوگئے تھے ، جو سیاسیات کی مختلف راہوں سے آشنا تھے ۔ علامہ اور سید صاحب سے طرح طرح کے سوالات کرتے رہے ۔ یہیں علامہ کے سکول کے زمانے کے ہندو دوست ، جو چمن میں مطب کرتے تھے ، ملنے آئے ۔

چمن سے ریل شروع ہو جاتی ہے مگر علامہ صاحب اور اُن کے ساتھیوں نے ایک دن بچانے کی خاطر موٹروں سے سفر کیا ۔ چمن سے ریل صرف ایک وقت

چلتی تھی - اگر ریل کا سفر اختیار کرتے تو رات چمن میں ٹھہرنا ضروری تھا - تقریباً چار بجے شام چمن سے روانہ ہوئے اور کوئٹہ تک چار گھنٹے کا سفر سید صاحب سے تبادلۂ خیالات میں گزارا - سید صاحب لکھتے ہیں :

''عجیب اتفاق کہ راستہ تو خطرناک در پیش تھا اور ڈاکٹر اقبال صاحب نے روحانیات کے ذاتی مشاہدات و تجارب اور ایک سچے پیر کی تلاش پر گفتگو شروع کر دی - گفتگو طرفین سے نہایت دلچسپ ہو رہی تھی - اس عہد کے مختلف شیوخ اور بزرگانِ سلاسل کا تذکرہ رہا - اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے آغازِ زندگی اور طالب علمانہ عہد کا ذکر چھیڑا - پھر اپنے والد مرحوم کا تذکرہ کیا - وہ خود ایک صاحبِ دل صوفی تھے اور دین دار علما کی صحبت میں رہتے تھے - اس ضمن میں یہ معلوم ہوا کہ ہمارے جلیل القدر اسلامی شاعر کے حسیّاتِ خفتہ کے تاروں میں جس مضراب نے حرکت پیدا کی وہ خود اُن کے والد ماجد کی ذات بابرکات تھی -''[۲۰]

علامہ اپنے والد مرحوم کی زندگی کے یادگار واقعات سناتے رہے -

۳ نومبر کو کوئٹہ میں رات ڈاک بنگلہ میں گزاری - دس بجے صبح سٹیشن پر آئے - گیارہ بجے گاڑی چلی اور ملتان تک سید صاحب اور علامہ کا ساتھ رہا - علامہ ملتان سے لاہور کی گاڑی میں بیٹھے اور اسی روز شام کو اپنے گھر پہنچ گئے -

اخباری بیان - ۶ نومبر ۱۹۳۳ کو علامہ نے اپنے ہمسفروں کے ایما پر اپنے دورے کے بارے میں حسب ذیل اخباری بیان جاری کیا :

''سب سے پہلے جو قابلِ ذکر چیز ہمیں نظر آئی وہ یہ ہے کہ افغانستان میں لوگوں کے جان و مال بالکل محفوظ ہیں - یہ ایک ایسی حکومت کے لیے بذات خود ایک بہت بڑی کامیابی ہے جسے صرف چار سال پیشتر ملک میں عام بغاوت کو فرو کرنا پڑا ہو - دوسری بات جس سے ہم متاثر ہوئے وہ وہاں کے وزرا کی نیک نیتی اور اخلاص ہے جس سے وہ اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں - سخت قسم کے قدامت پسند لوگ بھی ان وزرا کے حامی ہیں اور نتیجۃً جب کہ ہمارے سامنے ایک مقتدر افغان عالم نے کہا آج کے افغانستان میں ملاؤں اور نوجوانوں میں کوئی اختلاف نہیں -

''حکومتِ افغانستان کا ارادہ ہے کہ سارے محکمۂ تعلیم کو جدید طریقوں پر از سرِ نو ترتیب دیا جائے اور ساتھ ساتھ افغانستان اور ہمسایہ ممالک کے درمیان والی سڑکوں کی مرمت کی جائے - نئی یونیورسٹی بتدریج ترقی کر رہی ہے اور اس کے لیے پہلے ہی ایک خوب صورت اور وسیع محل مخصوص کر دیا گیا ہے -

۲۰- ''سیر افغانستان'' -

سب سے پہلے شعبۂ طب قائم کیا گیا ہے اور اس میں اعلیٰ تعلیم شروع ہو گئی ہے ۔ دوسرا شعبہ جس کا قیام زیرِ غور ہے وہ سول انجینیرنگ کا ہوگا ۔ رہا سڑکوں کا سوال ، تو کابل کو پشاور سے ملانے والی ایک نئی سڑک آئندہ دو سال کے عرصے میں مکمل ہو جائے گی ۔ اس سڑک کا نقشہ بڑے غور و فکر سے تیار کیا گیا ہے ۔ روسی سرحد تک جانے والی سڑک مکمل ہو چکی ہے اور یہ سڑک اس لیے بہت اہم ہے کہ یہ وسطی ایشیا کو وسطی یورپ سے قریب کر دیتی ہے ۔

اعلیٰ حضرت شاہ افغانستان نے ہمیں شرف باریابی بخشا اور کافی طویل گفتگو ہوتی رہی ۔ اعلیٰ حضرت کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ اُن کا ملک پھلے پھولے اور اپنے ہمسایہ ممالک سے صلح اور آشتی قائم رکھے ۔

''افغانستان آج ایک متحد ملک ہے ، جہاں ہر طرف بیداری کے آثار پائے جاتے ہیں اور حکام کافی سوچ بچار کے بعد نئے پروگرام بنا رہے ہیں ۔ افغانستان سے ہم اس یقین کے ساتھ واپس ہوئے ہیں کہ اگر موجودہ حکام کو دس سال تک اپنا کام جاری رکھنے کا موقع مل جائے تو بلا شک و شبہ افغانستان کا مستقبل روشن ہے ۔''[۲۱]

علامہ نے اس سفر کی یاد میں مثنوی ''مسافر'' لکھی اور افغانستان کے مناظرِ فطرت سے دل کھول کر لطف اُٹھایا ۔ جمال الدین احمد اور محمد عبدالعزیز کی تالیف ''افغانستان'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں :

''جب افغانستان کے بارے میں سوچتا ہوں ، اور اکثر ایسا ہوتا ہے ، تو میرے سامنے افغانوں کے دیس کی وہ تصویر گھومنے لگتی ہے جیسی میں نے پچھلے موسمِ خزاں میں دیکھی تھی ۔ میں ایک سادے سے آرام دہ کمرے میں بیٹھا ہوا ہوں ۔ آس پاس باغ ہے ۔ باغ سے ہرے زمین کا ایک بڑا ٹکڑا آہستہ آہستہ اوپر کو اُبھرتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ پہاڑی سلسلے میں جا ملتا ہے ۔ ایک کے پیچھے بلند ہوتی ہوئی پہاڑیوں کی ایک قطار ہے یہاں تک کہ یہ بلندیاں ہندو کش کے سلسلے تک جا پہنچتی ہیں ۔ دور تک پھیلے ہوئے میدانوں کے اس پار اُونچی اُونچی روشیں ہیں ، دور دراز سے آتی ہوئی طوفانی ہوائیں جنھیں چیرتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہیں ۔ اُوپر مغرب میں ڈوبتے ہوئے سورج کے حسین اور خوشنما رنگوں سے آراستہ آسمان نظر آتا ہے ۔ نیچے وادیوں میں سائے تیزی سے رینگتے ہوتے ہیں ۔ لا تعداد پتلے لمبے سرو کے درخت ان سایوں کے درمیان اپنے پر پھیلائے کھڑے ہیں ۔ سبک سیر ہوائیں ان کی پتیوں کو چومتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہیں ۔ شفق کے سکون میں وادی ، وادی کے درخت ، دور افتادہ کوُن اور دھندلے کہر کے سمندر میں بہتے ہوئے پہاڑ خوابوں جیسا حسین منظر پیش

۲۱- ''حرف اقبال'' ، ص ۲۳۱ - ۲۳۲ -

کرتے ہیں پھر ایکا ایکی شام کا جادو اذان کی آواز سے ٹوٹ جاتا ہے ۔ میرے سب ساتھی اپنی اپنی جگہیں چھوڑ دیتے ہیں ۔ موذن کی دل میں اتر جانے والی آواز مجھے کہیں اپنے سے بھی دور لے جاتی ہے اور میں مسجد میں سب کے بعد پہنچتا ہوں جہاں میرے ساتھی مہمان اور مصاحبوں کے ساتھ شاہی میزبان جمع ہیں ۔''۲۲

مآخذ

''حرف اقبال'' ۔

سید سلیمان ندویؒ ، ''سیر افغانستان'' ۔

''ماہ نو'' (ماہنامہ) بابت ۵ اپریل ۱۹۶۵ ۔

مثنوی ''مسافر'' ۔

''مقالات یوم اقبال'' (۱۹۶۷) ، مضمون سرور گویا اعتمادی ۔

عبدالسلام ندوی ، ''اقبال کامل'' ۔

ڈاکٹر ظہیرالدین ، ''اقبال کی کہانی'' ۔

''اسلامی تعلیم'' (سہ ماہی) ، اقبال نمبر ۔

۲۲- ''ماہ نو'' (اپریل ۱۹۶۵) ، ص ۱۲ ۔

ثروت صولت

اقبال کے ترکی زبان میں ترجمے

اپنے علمی ذخیرے کی وسعت کے لحاظ سے ترکی زبان عربی کے بعد اسلامی دنیا کی دوسری بڑی زبان ہے۔ تقریباً تمام مغربی زبانوں کے کلاسیکی ادب کا ترکی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ عربی اور فارسی کی بھی بیشتر اہم کتابیں ترکی میں منتقل ہو چکی ہیں۔ ترکوں نے اُردو سے بھی استفادہ کیا ہے اور عربی یا انگریزی کے توسط سے یا براہِ راست اُردو سے برِ صغیر پاکستان و ہند کے کئی مصنفوں کی کتابوں کا گزشتہ پچاس سال کے عرصے میں ترکی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان ہی مصنفین میں سے ایک اقبال ہیں۔

عربی دنیا میں اگرچہ اقبال کا تعارف ایک ترک شاعر نے کرایا لیکن خود ترکیہ میں اقبال کا تفصیلی تعارف دنیائے عرب اور ایران کے بعد ہوا۔ بہرحال گزشتہ چند سالوں میں اس کی بڑی حد تک تلافی ہوگئی ہے اور اس وقت اقبال کے منظوم کلام کا بیشتر حصہ ترکی میں ترجمہ ہو چکا ہے اور نثری تحریروں کا بھی ایک حصہ ترکی میں منتقل ہو چکا ہے۔ اس مضمون کا مقصد ان ہی کوششوں کا جائزہ لینا ہے جو اقبال شناسی کے سلسلے میں ترکیہ میں کی جا رہی ہیں۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، دنیائے عرب میں اقبال کو متعارف کرانے والی شخصیت ایک ترک کی تھی۔ یہ مشہور ترک شاعر اور ترکیہ کے قومی ترانے کے خالق محمد عاکف مرحوم تھے۔ یہ کام اُنھوں نے خود نہیں کیا۔ اُنھوں نے مصر میں (۱۹۲۶ تا ۱۹۳۶) قیام کے زمانے میں مشہور مصری ادیب عبدالوہاب عزام بے کو کلامِ اقبال کی اہمیت کا احساس دلایا، جس کے نتیجے میں عزام بے نے اقبال کے کلام کو عربی میں منتقل کرنے اور ان کے پیغام سے عربوں کو روشناس کرنے کا کام شروع کیا۔ جہاں تک ترکی زبان کا تعلق ہے، اس وقت تک ان دو اشعار کے سوا جن کا ترجمہ عاکف نے اپنی کتاب ''**صفحات**''

میں ایک نظم کے اندر کیا،[۱] غالباً اقبال کے کسی شعر کا ترجمہ ترکی زبان میں نہیں ہوا تھا۔

ترکی میں اقبال کے کلام کا ترجمہ عاکف کی وفات کے کئی سال بعد شروع ہوا اور اس کا سہرا ترکیہ کے بزرگ ادیب علی نہاد تارلان کے سر ہے جنھوں نے ترکیہ میں اقبال کو متعارف کرانے کے سلسلے میں وہی کردار ادا کیا جو عبدالوہاب عزام بے نے مصر اور عرب دنیا میں ادا کیا۔

علی نہاد تارلان ۔ ڈاکٹر علی نہاد تارلان کا شمار موجودہ دور کے ممتاز ترک ادیبوں میں ہوتا ہے ۔ وہ ۱۸۹۸ء میں استنبول میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۹ء میں استنبول یونیورسٹی سے فرانسیسی اور فارسی کی تکمیل کی اور پھر اسی یونیورسٹی سے ''اسلامی ادب میں لیلیٰ مجنوں سے متعلق مثنویاں''[۲] کے عنوان سے ایک تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔

ڈاکٹر علی نہاد تارلان نے فرانسیسی اور ترکی کے اُستاد کی حیثیت سے مختلف مدارس میں فرائض انجام دیے ۔ ۱۹۳۳ء میں وہ استنبول یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات و ادبیات میں لکچرار ہوئے اور ۱۹۴۲ء میں پروفیسر ہوگئے۔

ان کی ابتدائی تحریریں جو نظم و نثر پر مشتمل ہیں اور مختلف رسالوں میں شائع ہوئی تھیں ۱۹۵۳ء میں ''گونیش یاپرک'' *(Gunes Yaprak)* اور ۱۹۷۰ء میں ''کوگولر'' *(Kugular)* کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئیں ، لیکن ڈاکٹر تارلان کی حقیقی خدمات عثمانی دور کے ادب سے متعلق ہیں جو ''دیوان ادبیات'' کہلاتا ہے ۔ اُنھوں نے سالہا سال کی محنت کے بعد اس دور کی مختلف ادبی شخصیتوں ، مسائل اور متون کے بارے میں تحقیقات کیں اور ان کو کتابی شکل میں مرتب کیا ۔ ان کی یہ کتابیں سالِ اشاعت کے لحاظ سے حسب ذیل ہیں :

(۱) ادبی فنون سے متعلق (۱۹۳۱) ۔
(۲) شیخی کے دیوان کی تدقیق[۳] — دو جلد (۱۹۳۴ تا ۱۹۳۶) ۔
(۳) دیوانِ ادبیات میں توحید (۱۹۳۶) ۔
(۴) دیوانِ ادبیات میں معمہ (۱۹۳۶) ۔
(۵) متون کی شرح سے متعلق (۱۹۳۷) ۔

۱۔ محمد عاکف ، ''صفحات'' (استنبول ، ۱۹۷۴) ، صفحہ ۵۱۵ ۔
۲۔ *Islam Edebiyatinda Leyla ve Mecnun Mesnevisi* ۔
۳۔ یوسف سنان شیخی (۱۳۷۱ تا ۱۴۳۱) ۔ عثمانی ادب کا پہلا بڑا ترک شاعر جو بعد کے عثمانی شعرا کے لیے نمونہ بنا ۔ اس کا ''خرنامہ'' عثمانی ترکی ادب کی ہجویہ شاعری کا شاہکار سمجھا جاتا ہے ۔

(۶) متن کی اصلاح (۱۹۳۷) ۔
(۷) خیالی بے کا دیوان[۴] (۱۹۴۵) ۔
(۸) دیوان ادبیات میں شعر ۔
(۹) نجاتی بے کا دیوان[۵] (۱۹۶۳) ۔
(۱۰) احمد پاشا[۶] کا دیوان (۱۹۶۶) ۔
(۱۱) ذاتی[۷] کا دیوان (غزلیات) ، جلد اول (۱۹۶۸) ۔
(۱۲) محمد عاکف[۸] (۱۹۶۸) ۔

ڈاکٹر علی نہاد تارلان کا ترکی ادب کے بعد خاص موضوع فارسی ادب رہا ہے ۔ چنانچہ انھوں نے فارسی زبان کے شعرا کی متعدد اہم کتابوں کا ترکی میں ترجمہ بھی کیا ہے ۔ مثلاً نظامی کے ''دیوان'' اور ''مثنوی لیلیٰ مجنوں'' اور ''خسرو شیرین'' کا ترکی میں ترجمہ کیا ۔ عثمانی دور میں ترکیہ کے بہت سے شاعر فارسی میں بھی شعر کہتے تھے ۔ اس قسم کے ترک شعرا میں سے سلطان سلیم (۱۵۱۲ تا ۱۵۲۰) اور نفعی[۹] (۱۵۷۲ تا ۱۶۳۵) کے فارسی دیوانوں کا ترکی میں ترجمہ کیا ۔

اقبال کے تراجم بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے ۔ اس کام کا آغاز ڈاکٹر علی نہاد تارلان نے ۱۹۵۸ ہی میں کر دیا تھا ،[۱۰] لیکن ۱۹۶۸ کے بعد اقبال

۴۔ محمد خیالی (متوفی ۱۵۵۷) ۔ سلیمان قانونی کے دربار کا صفِ اول کا غزل گو شاعر تھا ۔ اس کو روم کا حافظ کہا جاتا ہے ۔

۵۔ عیسیٰ نجاتی (متوفی ۱۵۰۹) ۔ عثمانی ترکیہ کا پہلا بڑا غزل گو شاعر ہے کلاسیکی عثمانی شاعری کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے ۔

۶۔ احمد پاشا (متوفی ۱۴۹۷) ۔ سلطان محمد فاتح کا وزیر اور اس دور کا ایک ممتاز شاعر تھا ۔

۷۔ ذاتی (۱۴۷۷ تا ۱۵۴۶) ۔ سلیمان قانونی کے دور کا ممتاز شاعر ۔

۸۔ یہ کتاب علی نہاد تارلان نے علاقائی تعاون کے ادارے کی ثقافتی سرگرمیوں کے تحت انگریزی میں لکھی تھی ۔ اس کا اُردو ترجمہ کراچی یونیورسٹی کے تاریخِ اسلام اور ترکی زبان کے پروفیسر ڈاکٹر محمد صابر نے کیا ۔ یہ ترجمہ علاقائی تعاون کے ادارے کی پاکستانی شاخ کی طرف سے لاہور سے ۱۹۷۰ میں شائع ہوا ۔

۹۔ عمر نفعی (۱۵۷۲ تا ۱۶۳۵) کا شمار عثمانی ترکیہ کے سب سے بڑے پانچ کلاسیکی شعرا میں ہوتا ہے ۔ ترکیہ کا سب سے بڑا طنزگو شاعر تھا ۔

۱۰۔ ڈاکٹر علی نہاد تارلان کے ابتدائی ترجمے جو ''پیامِ مشرق'' اور ''زبورِ عجم'' کے بعض حصوں کے ترجموں پر مشتمل تھے مختلف اداروں کی طرف سے شائع ہوئے تھے ۔

کے کلام کے ترجموں کی طرف اُنھوں نے خاص طور پر توجہ دی ۔ اقبال کی جن کتابوں کا وہ اب تک ترجمہ کر چکے ہیں وہ حسب ذیل ہیں :

(۱) ''پیام مشرق'' : یہ ترجمہ ترکیہ پاکستان ثقافتی انجمن ، استنبول ، کی طرف سے ۱۹۶۳ میں شائع کیا گیا ۔

(۲) ''اسرار و رموز'' : یہ ترجمہ بھی ترکیہ پاکستان ثقافتی انجمن ، استنبول ، کی طرف سے ۱۹۶۴ میں شائع کیا گیا ۔

(۳) ''زبور عجم'' : یہ انتخاب ہے جو انقرہ کے ایک نجی ادارے ہلال یا ینلری (مطبوعات ہلال) کی طرف سے ۱۹۶۴ میں شائع کیا گیا ۔ ڈاکٹر تارلان اس سے قبل ''زبور عجم'' کے آخری حصہ ''گلشن راز جدید'' کا ترجمہ ۱۹۵۹ میں استنبول سے شائع کر چکے تھے ۔

(۴) ''ارمغان حجاز'' : فارسی حصے کا ترجمہ ۱۹۶۸ میں شائع ہوا ۔

(۵) ''ضرب کلیم'' : یہ ترجمہ ۱۹۶۸ میں استنبول سے شائع ہوا ۔ ترجمہ اُردو سے نہیں بلکہ ڈاکٹر عرفانی کے فارسی ترجمے سے ترک میں منتقل کیا گیا ۔

عبدالقادر قراخان ۔ عبدالقادر قرا خان بھی دور جدید کے ممتاز ترک ادیب ہیں ۔ وہ ۱۹۱۳ میں پیدا ہوئے ۔ ازمیر اور صامسون (Samson) کے مدرسوں میں معلّم کی حیثیت سے فرائض انجام دیے ۔ ۱۹۳۹ سے ۱۹۴۷ تک ازمیر کے کالجوں میں پڑھایا ۔ اس کے بعد استنبول یونیورسٹی میں پروفیسر ہو گئے اور ابھی تک اُسی منصب پر فائز ہیں ۔

عبدالقادر قرا خان شاعر بھی ہیں ۔ ان کا مجموعۂ کلام ''طلوع خورشید کا وطن''[۱۱] ۱۹۳۴ میں شائع ہوا ۔ ڈاکٹر تارلان کی طرح ان کا تحقیقی کام بھی ''دیوان ادبیات'' سے متعلق ہے ۔ یہ کام انھوں نے استنبول یونیورسٹی میں جانے کے بعد شروع کیا ۔ اس موضوع پر اب تک ان کی حسب ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں :

(۱) ''فضولی[۱۲] کے مکتوبات'' (۱۹۴۸) ۔

(۲) ''فضولی ، ماحول ، حالات اور شخصیت'' (۱۹۴۹) ۔ یہ عبدالقادر قرا خان کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے ۔

۱۱- *Gune Sin Dogduga Yurt* ۔

۱۲- محمد فضولی (۱۴۹۵ تا ۱۵۵۶) ۔ سب سے بڑا ترک شاعر سمجھا جاتا ہے ۔ سلیمان قانونی کے دور سے تعلق تھا لیکن دربار سے تعلق نہیں تھا ۔

(۳) ''نابی''[۱۳] (۱۹۵۳) ۔
(۴) ''نفعی'' (۱۹۵۴) ۔
(۵) ''ترکی کے اسلامی ادب میں چالیس احادیث'' (۱۹۵۴) ۔
(۶) ''فغانی[۱۴] اور اس کا مختصر دیوان'' (۱۹۶۶) ۔
(۷) ''نفعی کے دیوان سے انتخاب'' (۱۹۷۱) ۔

ڈاکٹر عبدالقادر قرا خان کو پاکستان سے گہری دلچسپی ہے ۔ وہ مختلف علمی اجتماعات میں شرکت کرنے کے لیے کئی دفعہ پاکستان بھی آ چکے ہیں ۔ غالباً پاکستان سے ان کی اسی دلچسپی نے ان کے لیے اقبال کے مطالعہ کی راہ ہموار کی اور اس وقت ڈاکٹر عبدالقادر قرا خان ترکی میں ڈاکٹر تارلان کے بعد دوسری بڑی ادبی شخصیت ہیں جنھوں نے ترکوں میں اقبال کو متعارف کرانے میں حصہ لیا ۔

ڈاکٹر عبدالقادر ترکیہ میں پاکستان کے سفارت خانے کے اخبار *Pakistan Postasi* میں اقبال سے متعلق مضامین لکھتے رہے ہیں جن کا انتخاب ۱۹۶۲ میں ''ترکیہ میں ڈاکٹر محمد اقبال'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے ۔ ان کا ایک مضمون بحیرۂ اسود کی بندرگاہ صامسون سے شائع ہونے والے اخبار ''اسلام سیسی'' *(Islam Sesi)* ، (صدائے اسلام) جلد اول ، شمارہ نمبر ۵ ، ۱۹۷۴ میں ترکیہ سے اقبال کی دلچسپی کے موضوع پر بھی شائع ہوا ہے ۔

اقبال سے متعلق ڈاکٹر قرا خان کی سب سے اہم اور تازہ ترین تصنیف ''ڈاکٹر محمد اقبال اور ان کی تصانیف سے انتخاب''[۱۵] ہے جو استنبول سے ۱۹۷۴ میں جمہوریہ ترکیہ کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر سنٹو کی ثقافتی سرگرمیوں کے تحت شائع ہوئی ہے ۔ کتاب بڑی تقطیع کے دو سو اکتیس صفحات پر مشتمل ہے ۔ ترکی اور انگریزی کے دیباچوں کے پندرہ صفحات ان کے علاوہ ہیں ۔ کتاب حسب ذیل حصوں میں منقسم ہے :

دیباچہ : مولف نے ترکی اور فارسی کی ادبی روایات سے بحث کرنے اور اقبال کی اہمیت بیان کرنے کے بعد بتایا ہے کہ کتاب کی تکمیل کے لیے مصنف نے فارسی ، عربی ، اُردو ، ترکی ، انگریزی اور فرانسیسی کی تقریباً ایک سو

۱۳- یوسف نابی (۱۶۴۲ تا ۱۷۱۲) ۔ کلاسیکی دور کا ممتاز شاعر جس کی شاعری جذبات سے زیادہ ذہن کو اپیل کرتی ہے ۔

۱۴- رمضان چلیبی فغانی (۱۵۰۵ تا ۱۵۳۲) ۔ محمد قانونی کا ممتاز شاعر جو ستائیس سال کی عمر ہی میں اس دنیا سے چل بسا ۔

۱۵- *Dr. Muhammed Ikbal ve Eserlerinden Secmeler* ۔

کتابوں اور مضامین کا مطالعہ کیا ۔ کتاب کی تکمیل میں جن حضرات سے مصنف کو مدد ملی ان میں دو پاکستانی ڈاکٹر یعقوب مغل (سندھ یونیورسٹی) اور ڈاکٹر محمد صابر (کراچی یونیورسٹی) بھی شامل ہیں ، جنھوں نے اُردو متن کا ترجمہ کرنے میں مدد دی ۔ کتاب کی اشاعت میں جن حضرات سے مدد ملی ، ان میں پاکستان کے محکمہ اطلاعات کے شریف الحسن صاحب کا ذکر بھی کیا ہے جو اُس زمانے میں انقرہ میں سنٹو کے اسسٹنٹ سکرٹری تھے ۔ پاکستان کے جن اداروں سے مصنف کو مدد ملی اور جن کی طرف سے کتابیں فراہم کی گئیں ان کا دیباچے میں تذکرہ کرنے کے بعد مصنف نے حسب ذیل حضرات کا خاص طور پر شکریہ ادا کیا ہے : اقبال اکادمی کراچی [اب لاہور] کے ڈاکٹر جناب معز الدین ، مجلس ترقی ادب کے صدر جناب حمید احمد خاں مرحوم ، پاکستان اُردو اکیڈمی لاہور کے جنرل سکرٹری ڈاکٹر سید عبداللہ ، بزم اقبال کے سید وقار عظیم اور ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی اور ڈاکٹر محمد اکرم ۔

یہ دیباچہ اکتوبر ۱۹۷۳ میں لکھا گیا تھا ۔*

(۱) مقدمہ : اصل کتاب مقدمہ سے شروع ہوتی ہے جو ایک سے چودہ صفحہ تک پھیلا ہوا ہے ۔ مقدمہ میں مصنف نے ترکیہ ، ایران اور پاکستان کے ثقافتی تعلقات کا جائزہ لیتے ہوئے ، صوفیہ کی اشاعتِ اسلام کی کوششوں ، فارسی اور ترکی ادب کے ایک دوسرے پر اثرات اور فنِ تعمیر کے مشترکہ پہلوؤں کا ذکر کیا ہے ۔

(۲) **ڈاکٹر محمد اقبال کے حالاتِ زندگی** : یہ حصہ صفحہ ۱۵ سے ۳۲ تک پھیلا ہوا ہے ۔ مصنف نے اقبال کے حالات کے سلسلے میں ان باتوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے جن کا ترکیہ سے تعلق ہے ۔ مثلاً ''بانگِ درا'' کے تذکرے میں ''بلادِ اسلامیہ'' اور ''محاصرۂ ادرنہ'' کا ذکر کیا ہے اور اقبال کا وہ مصرع بھی دیا ہے جس میں انھوں نے ۹ ستمبر ۱۹۲۲ کو ازمیر کو آزاد کرانے کی تاریخ کہی ہے :

گفت اقبال اسم اعظم مصطفیٰ

''پیامِ مشرق'' میں ''خطاب بہ مصطفیٰ کمال پاشا'' اور ''ضربِ کلیم'' میں ''مشرق'' کے زیرِ عنوان جو قطعہ ہے اور جس میں اتاترک کی طرف اشارہ ہے اس کا ذکر بھی کیا ہے ۔

*اس کا انگریزی ترجمہ اقبال اکادمی کے مجلہ ''اقبال ریویو'' بابت اکتوبر ۱۹۷۵ میں شائع ہو گیا ہے ۔

اس باب میں مصنف نے اس ترک فوجی وفد کا بھی ذکر کیا ہے جو ۱۹۲۴ میں برصغیر آیا تھا اور جس کے دو افسروں حیدر عصمت اور الیاس نے اقبال سے ملاقات کی تھی - ۱۹۳۲ میں مشہور ترک رہنما رؤف پاشا نے جامعہ ملیہ اسلامیہ ، دہلی ، میں جو چھ لکچر دیے تھے اور جن میں سے دو کی صدارت اقبال نے کی تھی مصنف نے ان کا ذکر بھی کیا ہے اور لکھا ہے کہ "ایک لکچر کی صدارت کے دوران اقبال نے اتحادِ اسلام کے موضوع پر تقریر کی تھی اور دوسری میں صرف ایک طنزیہ واقعہ بیان کیا جس کا ہدف انگریز تھے اور جو اقبال کی ترکوں اور ترکیہ سے دلچسپی اور محبت ظاہر کرتا ہے -" تعجب ہے کہ مصنف نے خالدہ ادیب خانم کی جامعہ ملیہ کی تقریروں کا کوئی تذکرہ نہیں کیا حالانکہ ان میں سے ایک تقریر کی صدارت اقبال نے کی تھی - یہ واقعہ ۱۹۳۵ کا ہے -[۱۶]

اس باب میں ڈاکٹر عبدالقادر نے عاکف اور اقبال کے باہمی تعلق کے بارے میں ایک دلچسپ انکشاف کیا ہے - وہ لکھتے ہیں کہ

"عاکف ڈاکٹر اقبال سے واقف تھے اور ان دونوں کے خیالات میں بعض اختلافات کے باوجود اتفاق پایا جاتا ہے - دونوں بیسویں صدی کے عظیم شاعرِ اسلام ہیں - دونوں نے معاشرے کی رہنمائی کی اور دونوں درد مند ہیں اور ان کا کلام ناصحانہ ہے اور یہ کہ دونوں اپنی شاندار تاریخ سے وابستگی رکھتے ہیں - عاکف نے اقبال کو ہمارے دور کا رومی کہا ہے - عزام بے اور عاکف نے خاص طور پر 'پیامِ مشرق' اور 'اسرار و رموز' کو مل کر پڑھا اور عاکف نے استنبول میں قیام کے زمانے میں ہندوستانی مسلمانوں کی ایک جماعت کو اپنی کتاب 'صفحات' کے چند نسخے اقبال تک پہنچانے کے لیے دیے تھے - یہ بات ترکیہ اور پاکستان کے دو ہم عصر نابغہ شاعروں کے درمیان تعلق کو ظاہر کرتی ہے -"

(۳) **تصانیف** : اس باب میں جو صفحہ ۳۳ سے ۴۴ تک پھیلا ہوا ہے مصنف نے اقبال کی تصانیف کا تعارف کرایا ہے - پہلے منظوم کتابیں لی ہیں - بعد میں منثور کتابیں : (۱) "علم الاقتصاد" (۱۹۰۳) ، (۲) "فلسفۂ عجم" (۱۹۰۸) اور (۳) "تشکیلِ الٰہیات جدید" (۱۹۳۰) -

کتابوں کا تعارف کراتے ہوئے مصنف نے ہر تصنیف کی خصوصیات کی نشاندہی اور اس کے ادبی مقام کا تعین کرنے کے ساتھ ان تراجم کا بھی ذکر کر دیا ہے جو دوسری زبانوں میں ہوئے ہیں - ترکی زبان میں ہونے والے

۱۶- ملاحظہ کیجیے "مکتوباتِ اقبال" مرتبہ سید نذیر نیازی -

ترجموں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے ۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے :

'اسرار خودی' یورپ کی مادہ پرستی اور ایرانی تصوف کے خلاف ایک ردِ عمل ہے ۔ رومی کی مثنوی کی طرح بحر رمل میں لکھی گئی ہے ۔ تہران سے 'کلیات اشعار فارسی' کے نام سے ۱۳۴۳ شمسی میں شائع ہوئی اور ۱۹۷۳ میں 'کلیات اقبال' (فارسی) کے نام سے جو مجموعہ شائع ہوا اس میں بھی شامل ہے ۔ انگریزی میں نکلسن نے ترجمہ کیا ۔ عربی ، ترکی ، اُردو ، پشتو ، سندھی اور پاکستان کی دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو گیا ہے ۔

'پیامِ مشرق' اقبال کے خوب صورت ترین فارسی اشعار کا مجموعہ ہے ۔ فرانسیسی ، جرمن ، ہنگاروی ، عربی ، اور ترکی میں ترجمہ ہو گیا ہے ۔ 'لالۂ طور' کے عنوان سے کتاب میں جو رباعیاں ہیں ان کا پروفیسر آربیری نے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے ۔

'جاوید نامہ' کے متعلق لکھا ہے کہ اس کا ترکی ترجمہ تفصیلی حواشی کے ساتھ ۱۹۵۸ میں انقرہ سے شائع ہو چکا ہے ۔

'بالِ جبریل' اُردو میں اقبال کی سب سے مشہور اور کامیاب کتاب سمجھی جاتی ہے ۔

'ضربِ کلیم' عبدالحمید عرفانی نے اقبال کے حالات اور افکار کے بارے میں تفصیلی تجزیہ کے ساتھ فارسی میں ترجمہ کیا اور اس ترجمے کو بنیاد بنا کر 'ضرب کلیم' کو ترکی زبان میں منتقل کیا گیا ۔

'تشکیلِ الٰہیات جدید' میں اقبال نے دینی فلسفے کو نئے سرے سے تشکیل کرنے کی کوشش کی ہے ۔ ۱۹۶۴ میں اس کا ترکی ترجمہ ہو گیا ۔''

(۴) **اقبال کی ادبی شخصیت اور فن** ۔ اس باب میں جو صفحہ ۴۵ سے ۵۸ تک پھیلا ہوا ہے ، مصنف نے اقبال کی ادبی شخصیت کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ تعلیم و تربیت ، ماحول ، یورپ کی تعلیم اور علما اور صوفیہ نے مل کر ان کی ادبی شخصیت پر اثر ڈالا ہے ۔ اقبال کو گفتار کا غازی قرار دے کر ان پر بے عملی کا الزام لگانے والوں کو مصنف نے جواب دیا ہے کہ

"جس طرح ایک ماہر نباتات سے یہ توقع کرنا کہ وہ باغبان کے فرائض بھی انجام دے غلط ہے ، اسی طرح ایک مفکر شاعر سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنے احساسات اور خیالات کو عملی جامہ بھی پہنائے اور ان کی خاطر منظم جد و جہد کرے صحیح نہیں ۔ ایک نظریہ کو پیش کرنا دوسری بات ہے اور اس کے لیے سامان فراہم کرنا اور اس کو کامیابی سے ہمکنار کرنا قطعی دوسری بات ہے ۔ بلاشبہ تاریخِ انسانی میں ایسے فولادی عزم والے لوگ ملتے ہیں جنھوں نے دونوں کام کیے ۔ لیکن یہ استثنائی مثالیں ہیں ۔''

عبدالقادر قرا خان لکھتے ہیں کہ

''اقبال کو بجا طور پر جدید دور کا رومی کہا جا سکتا ہے ۔ ان کی فارسی مکمل طور پر جدید فارسی نہیں کہی جا سکتی ، لیکن اس کے باوجود ایرانی اور فارسی جاننے والے دوسرے لوگ بغیر کسی مشکل کے ان کے کلام سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں ۔ بعض جگہ قواعد کی غلطیاں بھی ملتی ہیں لیکن اصل چیز ان کے افکار ہیں ۔ اقبال نے جدید ترین تصورات کو بڑی آسانی سے اور بڑی خوب صورتی سے بیان کیا ہے ۔ رہا اُردو کلام ، تو غالب کے بعد اُردو کی سب سے زیادہ خدمت جس نے کی وہ اقبال ہیں ۔''

(د) **دنیا اور زندگی کے بارے میں اقبال کے نظریات ۔** اس باب میں مصنف نے اقبال کے افکار پر نظر ڈالتے ہوئے خودی ، انسانِ کامل ، عشق و عقل ، عقل اور علم سے مختصر بحث کی ہے ۔ ڈاکٹر عبدالقادر نے لکھا ہے کہ

''اقبال انسان کو اشرف المخلوقات سمجھتے تھے ، اسلام کی اور اسلامی ثقافت کے صحیح ہونے پر یقین رکھتے تھے اور اس بات پر زور دیتے تھے کہ اسلامی معاشرے کو صرف علم اور عقل کے راستے سے نہیں بلکہ حضرت محمدؐ اور ان کے صحابہ کے نقشِ قدم پر چل کر صحیح بنیادوں پر قائم کیا جا سکتا ہے ۔''

یہ باب صفحہ ۵۹ سے ۶۹ تک پھیلا ہوا ہے ۔

انتخابِ کلام ۔ اقبال کی زندگی ، تصانیف اور تصورات سے بحث کرنے کے بعد ڈاکٹر عبدالقادر نے اقبال کی تمام منظوم کتابوں سے ان کے کلام کے منتخب نمونے پیش کیے ہیں ۔ ایک صفحے پر اصل متن ہے اور دوسرے صفحے پر اس کا ترجمہ ۔ فارسی متن غالباً ''کلیات اقبال'' کے اس مجموعے کی فوٹو کاپی ہے جو تہران سے شائع ہوا تھا ۔ اسی طرح اُردو متن لاہور سے شائع ہونے والی کتابوں کے صفحات کی فوٹو کاپی کی شکل میں دیا گیا ہے ۔ نظموں کا یہ انتخاب صفحہ ۷۰ سے ۱۷۵ تک پھیلا ہوا ہے اور چوّن نظموں یا ان کے اقتباسات پر مشتمل ہے ۔ تفصیل یوں ہے :

اسرارِ خودی : مثنوی "اسرارِ خودی" کی تمہید سے ۲۸ اشعار ۔ پہلا شعر یہ ہے :

باز بر خوانم ز فیضِ پیرِ روم   دفترِ سر بستہ اسرارِ علوم

اور آخری شعر یہ ہے :

بر گرفتم پردہ از رازِ خودی   وا نمودم سرِ اعجازِ خودی

اس کے بعد تمہید ہی سے سات شعر اور دیے ہیں ۔ جو ''شاعری زین مثنوی مقصود نیست'' سے شروع ہو کر ذیل کے شعر پر ختم ہوتے ہیں :

خردہ بر مینا مگیر ای ہوشمند دل بذوق خردہ مینا بہ بند

''اسرار خودی'' سے تیسرا اقتباس ''در بیان اینکہ خودی از عشق و محبت استحکام می پذیرد'' کے ابتدائی دس اشعار پر مشتمل ہے ۔

چوتھا اقتباس در حقیقت ''شعر و اصلاح ادبیات اسلامیہ'' کے ابتدائی تیرہ اشعار پر مشتمل ہے ۔

''اسرار خودی'' سے پانچواں اقتباس ''در شرح اسرار اسمائے علی مرتضیٰ'' کے ابتدائی چھ اشعار پر مشتمل ہے ۔

رموز بے خودی ۔ ''رموز بے خودی'' سے حسب ذیل دو اقتباسات لیے گئے ہیں : ''پیش کش بحضور ملت اسلامیہ'' کے ابتدائی سات اشعار اور ''در معنیٔ ربط فرد و ملت'' کے ابتدائی بارہ اشعار ۔

پیام مشرق ۔ ''پیام مشرق'' سے حسب ذیل نظمیں اور غزل لی گئی ہیں :

(۱) ''محاورہ مابین خدا و انسان'' ۔

(۲) ''الملک للہ'' ۔

(۳) ''عشق'' ۔

(۴) ''خطاب بہ مصطفیٰ کمال پاشا'' ۔

(۵) غزلیات سے صفحہ ۲۱۳ کی وہ غزل جس کا مطلع یہ ہے :

بیا کہ بلبل شوریدہ نغمہ پرداز است عروس لالہ سراپا کرشمہ و ناز است

زبور عجم ۔ ''زبور عجم'' سے حسب ذیل اقتباسات لیے گئے ہیں :

(۱) ''زبور عجم'' حصہ دوم سے نظم نمبر ۱۹ جس کا پہلا مصرع یہ ہے :

اے غنچۂ خوابیدہ چو نرگس نگران خیز

(۲) غزل نمبر ۲۹ جس کا پہلا مصرع یہ ہے :

ما از خدائے گم شدہ ایم او بجستجوست

(۳) نظم نمبر ۳۰ جس کا پہلا مصرع یہ ہے :

خواجہ از خون رگ مزدور سازد لعل ناب

(۴) غزل نمبر ۳۷ جس کا پہلا مصرع یہ ہے :

من بندۂ آزادم عشق است امام من

جاوید نامہ ۔ (۱) فلک عطارد سے وہ حصہ جس کا موضوع ''شرق و غرب'' ہے اور جس میں سعید حلیم پاشا اور زندہ رود اور افغانی کی گفتگو دی گئی ہے ۔ لیکن اس میں ذیل کے چار اشعار جن میں سعید حلیم پاشا نے مصطفیٰ کمال پر تنقید کی ہے نکال دیے گئے ہیں :

نو نگردد کعبہ را رختِ حیات گر زافرنگ آیدش لات و منات
ترک را آہنگ نو در چنگ نیست تازہ اش جز کہنۂ افرنگ نیست
سینۂ او را دمے دیگر نبود در ضمیرش عالمے دیگر نبود
لا جرم با عالمِ موجود ساخت مثلِ موم از سوزِ ایں عالم گداخت

(۲) پیر رومی بہ زندہ رود می گوید کہ شعرے بیار ''جاوید نامہ''، صفحہ ۹۲ ۔
(۳) غزل زندہ رود (''جاوید نامہ'' صفحہ ۹۳) ۔
(۴) نوائے حلاج ۔
(۵) حلاج کے ابتدائی سات شعر (''جاوید نامہ'' صفحہ ۱۳۹) جس کا پہلا مصرع یہ ہے :

مردِ آزادے کہ داند خوب و زشت

(۶) ''حضور'' کے ابتدائی گیارہ اشعار (''جاوید نامہ''، صفحہ ۲۲۱)

پس چہ باید کرد ۔ (۱) تمہید کے ابتدائی اُنیس اشعار ۔
(۲) صفحہ ۶۰ - ۶۱ کے گیارہ اشعار جن کا آغاز ذیل کے مصرع سے ہوتا ہے :

سوز و ساز و درد و داغ از آسیاست

مسافر ۔ بر مزار شہنشاہِ بابرخلد آشیانی

ارمغانِ حجاز ۔ ''ارمغانِ حجاز'' کے فارسی حصہ سے گیارہ رباعیاں جو حضورِ حق، حضورِ رسالت، رومی، دل، خودی اور بہ یاران طریق سے لی گئی ہیں ۔ ان میں چار رباعیاں ایسی ہیں جن میں رومی کا نام آتا ہے ۔

بانگِ درا ۔ ''بانگِ درا'' سے حسب ذیل سات نظموں کے ترجمے دیے گئے ہیں ؛ (۱) بچے کی دعا ؛ (۲) شمع و پروانہ ؛ (۳) بلاد اسلامیہ میں سے وہ بند جس میں قسطنطنیہ کا تذکرہ ہے ؛ (۴) ترانۂ ملی ؛ (۵) حضور رسالت مآب میں ؛ (۶) دعا (یا رب دل مسلم کو ۔ ۔ ۔) ؛ (۷) محاصرۂ ادانہ ۔

بالِ جبریل : (۱) غزل : جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آ گاہی ۔
(۲) غزل : ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ۔
(۳) پیر و مرید ۔
(۴) جاوید کے نام ۔

ضربِ کلیم : (۱) طالب علم ۔ (۲) امتحان ۔

ارمغانِ حجاز : "ارمغانِ حجاز" کے اُردو حصے سے چھ رباعیاں : (۱) غریبی میں ہوں محسود امیری
(۲) خرد کی تنگ دامانی سے فریاد
(۳) کہا اقبال نے شیخِ حرم سے
(۴) تمیز خار و گل سے آشکار
(۵) ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
(۶) خرد دیکھے اگر دل کی نگہ سے

تشکیل الٰہیات جدید ۔ انگریزی کتاب سے ذیل کے دو بابوں کے اجزا کا ترجمہ :

Knowledge and Religious Experience (1)

The Spirit of Muslim Culture (2)

پہلے باب کا ترجمہ اقبال کے انگریزی خطبات مطبوعہ شیخ محمد اشرف کے صفحہ ۸ سے صفحہ ۱۶ تک کی عبارت کا ترجمہ ہے ، اور دوسرا ترجمہ The Spirit of Muslim Culture والے باب کے آغاز سے (صفحہ ۱۲۴) صفحہ ۱۲۷ تک کی عبارت کا ہے ۔

اس جگہ یہ بات قابلِ غور ہے کہ شیخ محمد اشرف والے نسخے میں قرآنی آیات کے نمبروں کے جو حوالے ہیں وہ بعض جگہ غلط ہیں یعنی ایک دو آیت آگے اور پیچھے ہو گئی ہیں ، لیکن ڈاکٹر عبدالقادر نے جو حوالے دیے ہیں وہ صحیح ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ حوالے کسی دوسرے نسخے سے مرتب کیے ہیں یا پھر قرآن میں دیکھ کر ان کی تصحیح کی ہے ۔

انگریزی خطبات کا ترکی ترجمہ صوفی حوری نے کیا ہے جو ۱۹۶۴ میں استنبول سے شائع ہوا ۔

اقبال کے خطوط ۔ اس حصے میں قائد اعظم کے نام اقبال کے تین خطوط اور ان کا ترکی ترجمہ دیا گیا ہے ۔ یہ خطوط بالترتیب ۲۳ مئی ۱۹۳۶ ، ۲۵ جون ۱۹۳۶ اور ۲۰ مارچ ۱۹۳۷ کے ہیں ۔

کتاب کے آخر میں ''کتابیات'' دی گئی ہے جس میں اقبال کی تصانیف کی مکمل فہرست مع سن طباعت دی گئی ہے ۔ مختلف زبانوں میں جن کتابوں کے ترجمے ہوئے ہیں ان کا بھی تذکرہ کیا ہے ۔ مضامین ، مکتوبات اور تقریروں کے مطبوعہ مجموعوں کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے ۔

آخر میں انڈکس ہے جو اشخاص ، کتب اور مقامات پر مشتمل ہے ۔ کتاب میں چار تصاویر بھی ہیں ۔ ایک تصویر صرف اقبال کی ہے ، دوسری میں اقبال عطیہ بیگم کے ساتھ ہیں اور تیسری تصویر میں اقبال لاہور میں اپنے شاگردوں اور اپنے ساتھی اساتذہ کے ساتھ دکھائے گئے ہیں ۔ آخری تصویر ان اہلِ علم حضرات کی ہے جو البیرونی سے متعلق ایک کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے پاکستان آئے تھے ۔ یہ حضرات جن میں ڈاکٹر عبدالقادر قرا خان بھی شامل ہیں ، تصویر میں مزارِ اقبال پر فاتحہ خوانی میں مصروف دکھائے گئے ہیں ۔

مختصر یہ کہ ڈاکٹر عبدالقادر قرا خان کی یہ کتاب ترکی میں اقبال سے متعلق لکھی ہوئی کتابوں میں سب سے مکمل اور جامع کتاب ہے ۔

محمد حمزہ فاروقی

علم الاقتصاد

''علم الاقتصاد'' اقبال کی وہ پہلی باضابطہ تصنیف ہے جسے بجا طور پر اردو زبان میں معاشیات کے موضوع پر پہلی معیاری اور جامع تصنیف کا درجہ حاصل ہے ۔ اس کی زیادہ شہرت نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اقبال نے اسے دوبارہ شائع نہ کرایا ۔ اُردو داں طبقے میں اس موضوع کا زیادہ چرچا نہ تھا ۔ تیسرے ، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اقبال کے نظریات بھی تبدیل ہو گئے اور اس موضوع میں بے پناہ وسعت پیدا ہوتی گئی ۔ یہ طے ہے کہ اقتصادی مسائل سے ان کی دلچسپی آخر دم تک رہی ۔ چنانچہ آپ نے زندگی کے آخری دور میں جو خطوط قائدِ اعظم محمد علی جناح کے نام لکھے تھے ان میں اقبال نے بار بار اسلامی مملکت کے قیام کے نصب العین کے علاوہ اقتصادی بہتری کی طرف بھی توجہ دلائی تھی ۔[1] اس کے علاوہ آپ کے کلام میں بھی معاشی نظام کے بارے میں اشارے ملتے ہیں ۔ ان واضح تصوّرات اور اس تصنیف کی موجودگی میں یہ کہنا زیادتی ہے کہ اقبال نے معاشی اصولوں کو نظرانداز کیا تھا یا کہ آپ جدید دور کے معاشی اور عمرانی تقاضوں سے نابلد تھے ۔

یہ تصنیف عرصے سے نایاب تھی ۔ ۱۹۷۱ میں اقبال اکادمی کراچی نے اسے دوبارہ شائع کیا ۔[2] اس تصنیف کی جانب اقبال کے بیشتر ناقدین نے توجہ نہیں کی تھی ۔ اقبال کے بعض سیرت نگاروں نے بھی اس کا تذکرہ سرسری انداز

۱۔ حوالہ کے لیے دیکھیے شیخ عطاء اللہ ، مرتّب ''اقبال نامہ'' ، ج ۲ ، ص ۳-۳۳ ۔

۲۔ جدید ایڈیشن میں ممتاز حسن اور ڈاکٹر انور اقبال قریشی نے اپنے مقدموں میں اسے علمِ معاشیات پر اُردو میں پہلی کتاب قرار دیا ہے اور اس کا سنِ اشاعت ۱۹۰۳ متعین کیا ہے ۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں ۔ سنِ اشاعت کے بارے میں غلط فہمی کی وجہ یہ تھی کہ کتاب کے اوّلین ایڈیشن پر سنِ تصنیف نہیں لکھا تھا ۔ بقیہ تفصیلات آئندہ صفحات پر دیکھیے ۔

میں کیا تھا ، مثلاً ''اقبالِ کامل'' (از عبد السلام ندوی) ، ''ذکرِ اقبال'' (عبدالمجید سالک) اور ''روزگارِ فقیر'' (از فقیر سید وحید الدین) ۔

مولانا عبدالمجید سالک لکھتے ہیں : ''جب علامہ لاہور میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد پروفیسر مقرر ہوئے ، ان دنوں انہوں نے اکنامکس پر اُردو میں ایک کتاب لکھی جو 'علم الاقتصاد' کے نام سے شائع ہوئی لیکن چونکہ وہ ان کی ابتدائی کوشش تھی اور اس کے بعد اقتصادیات کے نظریات و اصطلاحات وغیرہ میں خاصے تغیّرات ہو چکے ہیں ، اس لیے وہ اس کے دوبارہ چھاپنے کے روادار نہ تھے ۔''[۳]

فقیر سید وحید الدین رقم طراز ہیں : ''اُردو زبان میں جدید معاشیات پر یہ پہلی کتاب علامہ اقبال کی سب سے پہلی تصنیف ہے ۔ ۱۹۰۳ میں لاہور سے شائع ہوئی تھی ۔ علامہ اقبال اس وقت گورنمنٹ کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے ۔ کتاب میں قومی معیشت ، زمین ، محنت ، سرمایہ ، مسئلہ قدر ، منافع ، اجرت ، مال گزاری ، لگان ، سود ، آبادی اور تجارت بین الاقوام کے موضوعات پر نہایت مفید بحث کی گئی ہے ۔''[۴]

یہاں فقیر صاحب سے لغزش ہوئی ہے ۔ یہ کتاب دسمبر ۱۹۰۴ میں شائع ہوئی تھی ، نہ کہ ۱۹۰۳ میں ۔ جب یہ کتاب زیر طبع تھی تو اس کا ایک باب ماہنامہ ''مخزن'' میں ''آبادی'' کے عنوان سے اپریل ۱۹۰۴ میں شائع ہوا تھا ۔[۵]

مضمون سے قبل مدیر ''مخزن'' شیخ سر عبدالقادر نے درج ذیل نوٹ لکھا تھا : ''شیخ محمد اقبال صاحب ایم ۔ اے ۔ نے حال میں ایک کتاب پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے ایما سے علم الاقتصاد کے موضوع پر لکھی ہے جس کا انگریزی نام ''پولٹیکل اکانومی'' ہے اور جسے عموماً ''علمِ سیاستِ مدن'' کہتے ہیں ۔ بلا مبالغہ اس فن میں ایسی جامع اور عام فہم کتاب اُردو زبان میں آج تک نہیں لکھی گئی ۔ ہندوستان میں اس علم کا ابھی بہت کم چرچا ہے ۔ حالانکہ اسے بغور پڑھنے کی ہندوستان کو نہایت ہی ضرورت ہے ۔ جب یہ کتاب شائع ہوگی تو ہمیں کامل امید ہے کہ شیخ صاحب کی شہرت اور اس کی ذاتی مقبولیت کو اڑا کر لائے گی ۔ اور علاوہ عام قدردانی کے خاص جماعتیں اسے خریدیں گی ۔ ٹیکسٹ بک کمیٹی نے اسے پسند کیا ہے اور ایک سو جلدیں خریدنا منظور

۳۔ ''ذکر اقبال'' (بزمِ اقبال ، لاہور) ، ص ۲۹۱ ۔
۴۔ ''روزگارِ فقیر'' ، ج ۲ ، ص ۶۴ ۔
۵۔ ''مخزن'' ، ج ۱ ، نمبر ۱ (اپریل ۱۹۰۴) ، ص ۱-۸ ۔

فرمایا ہے - ہم قابل مصنف کی اجازت سے اس کا ایک دلچسپ حصہ نقل کرتے ہیں - کتاب زیر طبع ہے -"

یہ کتاب ''خادم التعلیم اسٹیم پریس لاہور'' سے شائع ہوئی تھی - سن اشاعت کے بارے میں مختلف مصنفوں نے لغزشیں کی ہیں ، مثلاً قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی لکھتے ہیں ٦: ''اُردو میں پولیٹیکل اکانومی پر اقبال کی سب سے پہلی تصنیف ہے جو ۱۹۰۱ میں شائع ہوئی تھی اور آج کل نایاب ہے - اس کا اصل مسودہ اقبال نے عطیہ بیگم کو دیا تھا - اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ مولانا شبلی نے اس کی زبان درست کی تھی جیسا کہ خود اقبال نے دیباچے میں ذکر کیا ہے -''٧

یہ کتاب اس موضوع پر پہلی تصنیف نہیں تھی - جیسا کہ مشفق خواجہ صاحب نے اپنے قابل قدر مقالے ''اقبال کا پہلا علمی کارنامہ—علم الاقتصاد''٨ میں یہ ثابت کیا ہے ، اس کتاب کی اشاعت سے قبل اُردو میں کئی کتابیں اس موضوع پر شائع ہو چکی تھیں جن میں اوّلیت کا شرف Wayland کی کتاب *Elements of Political Economy* کے ترجمے کو حاصل ہے جس کا سن اشاعت ۱۸۴۵ ہے -

اقبال نے علم الاقتصاد کے بارے میں ۲۴ اپریل ۱۹۰۷ کو بیگم عطیہ فیضی کے نام ایک خط میں لکھا تھا : ''میں آپ کو اپنی پولیٹیکل اکانومی (اُردو ایڈیشن) بھیجنے کا خیال کر رہا تھا لیکن مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس یہاں اس کا ایک بھی نسخہ موجود نہیں ہے - اگرچہ ہندوستان سے اسے منگانے میں کوئی دشواری نہ ہوگی - میں اس میل (ڈاک) سے اس کے لیے خط لکھ دوں گا -''٩

یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اقبال نے مطبوعہ نسخہ بیگم عطیہ فیضی کی خدمت میں پیش کیا تھا یا نہیں ، لیکن آپ نے اس کا اصل مسودہ ۱٦ جولائی ۱۹۰۷ کو

٦- ''اقبالیات کا تنقیدی جائزہ'' (اقبال اکادمی ، کراچی ، ۱۹۵۵) ، ص ۲۱ -

٧- ''علم الاقتصاد'' کے دیباچے میں ہے : ''مخدوم و مکرم جناب قبلہ مولانا شبلی نعمانی مدظلہ' بھی میرے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس کتاب کے بعض حصوں میں زبان کے متعلق قابل قدر اصلاح دی -''

٨- سہ ماہی ''اردو'' ، جولائی ۱۹٦۰ ، ص ۱٦۱-۱۷۸ -

٩- ''اقبال از عطیہ بیگم'' مترجم ضیاء الدین برنی (اقبال اکادمی ، کراچی ، ۱۹٦۹) ، ص ۲۰ -

عطیہ فیضی کو تحفۃً پیش کیا تھا ۔ ''دوسرے دن اقبال نے مجھے اپنی پولیٹیکل اکانومی کا اصل مسودہ تحفہ کے طور پر دیا اور ساتھ ہی وہ مقالہ بھی جس پر انہیں ڈگری ملی تھی ۔ بعد کو وہ جرمن زبان میں ترجمہ ہو کر شائع ہوا ۔ اس فاضلانہ مقالے کی بدولت ان کی ناموری ، شہرت اور وقار میں بے حد اضافہ ہو گیا ۔''۱۰ یہ دونوں مسودے ۲۳ جولائی ۱۹۰۷ کو پروفیسر آرنلڈ نے لے کر محفوظ کر لیے تھے ۔ اقبال کی عطیہ فیضی اور پروفیسر آرنلڈ سے لندن میں ملاقات ہوئی تھی ۔۱۱

''علم الاقتصاد'' دسمبر ۱۹۰۳ میں چھپ کر تیار ہو چکی تھی ۔ اس کا اشتہار دسمبر ۱۹۰۳ کے ''مخزن'' میں مدیر ''مخزن'' شیخ عبدالقادر نے شائع کیا تھا : ''ہم ناظرین کو بڑی خوشی سے اطلاع دیتے ہیں کہ یہ قابل قدر کتاب جس کا ایک باب مخزن میں شائع ہو چکا ہے چھپ کر تیار ہو گئی ہے ۔ جس عرق ریزی سے شیخ صاحب نے یہ کتاب لکھی ہے اور جس خوبی سے انہوں نے علم الاقتصاد کے دقیق اصول کو واضح کیا ہے ، اس کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں اس قسم کی کتابیں پڑھنے کا اتفاق ہوتا رہتا ہے ۔ توضیح اصول کے ساتھ ساتھ مصنف نے ہندوستان کی موجودہ تمدنی ، اخلاق اور اقتصادی حالات کی طرف لطیف اشارے کیے ہیں ، جن سے پڑھنے والے کی نظر وسیع ہوتی ہے اور اس کو مسائل اقتصاد پر آزادانہ غور و فکر کرنے کی تحریک ہوتی ہے ۔ زر نقد کی ماہیت پر جو کچھ لکھا ہے کہ ایک خاص منطقیانہ ربط رکھتا ہے جس سے عقلی مسرت ہونے کے علاوہ بعض اہم مسائل پر عجیب قسم کی روشنی پڑتی ہے ۔ ہم امید کرتے ہیں کہ اُردو لٹریچر کے ذخیرے میں یہ قابل قدر اضافہ وقعت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا ، اور اس کے مسائل پر کماحقہٗ غور کیا جائے گا ، کیونکہ ہندوستان کی آئندہ قسمت کا دار و مدار زیادہ تر اس ملک کے موجودہ اقتصادی حالات پر منحصر ہے ۔ اب وقت اس بات کا مقتضی ہے کہ پبلک کم وزنی لٹریچر سے دستبردار ہو کر ان کتابوں کی طرف متوجہ ہو جن کا موضوع انسان کی عملی زندگی اور اس کے تمدنی حالات پر غور کرنا ہے ۔ اس کتاب کی قیمت صرف ایک روپیہ (عہ) ہے اور مصنف سے مل سکتی ہے ۔''۱۲

جولائی ۱۹۰۵ کے ''مخزن'' میں دوبارہ اس کتاب کا اشتہار چھپا تھا : ''علم الاقتصاد یا سیاست مدن ۔ مصنف شیخ محمد اقبال ، ایم ۔ اے ۔ اسسٹنٹ پروفیسر

۱۰۔ ایضاً ، ص ۳۱ ۔ ۱۱۔ ایضاً ، ص ۳۳ ۔
۱۲۔ ''مخزن'' ، جلد ۸ ، نمبر ۳ (دسمبر ۱۹۰۳) ۔

گورنمنٹ کالج لاہور ۔ جس میں علم الاقتصاد کے دقیق اصول کی توضیح کے ساتھ ساتھ مصنف نے ہندوستان کی موجودہ تمدنی ، اخلاقی اور اقتصادی حالات کی طرف لطیف اشارے کیے ہیں ، جن سے پڑھنے والے کی نظر وسیع ہوتی ہے اور اس کو مسائل اقتصاد پر آزادانہ غور و فکر کرنے کی تحریک ہوتی ہے ۔ منگا کر دیکھیے (عہ کو مخزن ایجنسی لاہور سے ملتی ہے) محصول ڈاک علاوہ ۔''[13]

اس اشتہار کے بعد شیخ عبدالقادر کا پیش کردہ اشتہار نما ریویو دوبارہ ''مخزن'' میں شائع ہوا ۔[14] اگلے شمارے میں دوبارہ جولائی ۱۹۰۵ کا اشتہار شائع ہوا ۔[15] اس اشتہار کا آخری مرتبہ اعادہ مئی ۱۹۰۸ کو ہوا تھا ۔[16] اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ تصنیف دسمبر ۱۹۰۳ سے ۱۹۰۸ کے اواخر تک بازار میں موجود رہی ۔ اقبال ۷ ستمر ۱۹۰۵ کو بمبئی سے انگلستان کے لیے روانہ ہو چکے تھے ۔[17] جانے سے قبل آپ نے اس کے حقوق مخزن ایجنسی کے سپرد کر دیے تھے ۔ آپ کی واپسی ستمبر ۱۹۰۸ کو ہوئی تھی اور اس عرصے میں یہ کتاب مخزن ایجنسی کی وساطت سے فروخت ہوتی رہی ۔

اب آخری مسئلہ یہ رہ جاتا ہے کہ یہ کتاب کس دور میں مرتب ہوئی تھی ۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کے مقالے ''اقبال اورینٹل کالج میں'' سے یہ اُلجھن دور ہو جاتی ہے ۔ اوربنٹل کالج کی سالانہ رپورٹ (بابت ۱۹۰۱ - ۱۹۰۲) میں اس کا تذکرہ ملتا ہے ۔ یہ رپورٹ ۸ جون ۱۹۰۲ کو مرتب ہوئی تھی ۔ اقبال اس زمانے میں اورینٹل کالج میں میکلوڈ عربک اسکالر تھے اور آپ نے اس سال مندرجہ ذیل تراجم و تالیفات مرتب کیے تھے :

(۱) تاریخ کے موضوع پر Stubbs کی تصنیف *Early Planteguents* کی تلخیص اور اُردو ترجمہ ۔

(۲) علم الاقتصاد کے موضوع پر واکر (Walker) کی تصنیف *Political Economy* کی اُردو میں تلخیص اور ترجمہ ۔

۱۳- ایضاً ، جلد ۹ ، نمبر ۴ (جولائی ۱۹۰۵) ، ص ۱۰ ۔
۱۴- ایضاً ، جلد ۱۲ ، نمبر ۳ (دسبر ۱۹۰۶) ۔
۱۵- ایضاً ، جلد ۱۲ ، نمبر ۴ (جنوری ۱۹۰۷) ۔
۱۶- ایضاً ، جلد ۱۵ ، نمبر ۲ (مئی ۱۹۰۸) ۔
۱۷- اس کی تفصیل اقبال نے اپنے ایک خط بنام مولوی انشاء اللہ خاں ، مدیر ''وطن'' مورخہ ۱۲ ستمبر ۱۹۰۵ میں دی تھی ۔

(۳) علم الاقتصاد پر ایک نئی تصنیف (زیر ترتیب) ۔[18]

یہ آخری تصنیف ''علم الاقتصاد ، سیاست مدن'' تھی ۔ جس زمانے میں اقبال نے یہ کام شروع کیا تھا آپ میکلوڈ عربک ریڈر تھے ۔ ۱۹۰۲ کے بعد آپ کی خدمات گورنمنٹ کالج کو بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر منتقل ہو گئیں ۔ یہ کتاب آپ نے سر آرنلڈ کے اصرار پر درسی ضرورتوں کے تحت مرتب کی تھی ۔ دوران تعلیم معاشیات اقبال کا خاص موضوع نہیں تھا لیکن آپ نے اس میں اس قدر استعداد بہم پہنچائی تھی کہ گورنمنٹ کالج کی اعلیٰ جماعتوں کو اس کی تعلیم دی تھی ۔ آپ نے اپنے مکتوب بنام کشن پرشاد مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۱۷ء میں لکھا تھا : ''۔ ۔ ۔ میں نے پنجاب گورنمنٹ کالج میں علم الاقتصاد ، تاریخ اور انگریزی بی ۔ اے ۔ اور ایم ۔ اے ۔ کی جماعتوں کو پڑھائی ہے اور حکام بالا دست سے تحسین حاصل کی ہے ۔''[19]

اس کتاب کا ابتدائی خاکہ تو ۱۹۰۲ میں مرتب ہو چکا تھا لیکن اس کی تکمیل ۱۹۰۳ یا ۱۹۰۴ کے ابتدا میں ہوئی ۔ ''مخزن'' میں شائع شدہ مضمون ''آبادی'' سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ''علم الاقتصاد'' اپریل ۱۹۰۴ سے قبل پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے ایما سے مرتب کی جا چکی تھی اور اس وقت طباعت کے مراحل سے گزر رہی تھی ۔ دسمبر ۱۹۰۴ میں ''علم الاقتصاد'' زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی تھی ۔ اس طرح اقبال نے اس تصنیف کی تیاری میں ۱۹۰۲ سے ۱۹۰۴ تک دو سال صرف کیے تھے ۔ اس عرصے میں آپ نے اس کی زبان و بیان کی نوک پلک سنوارنے کے لیے مولانا شبلی نعمانی کو بھی مسودہ بھیجا تھا ۔ معاشیات کی انگریزی اصطلاحات کا ترجمہ اس دور میں بے حد دشوار تھا اور یہ مرحلہ آپ نے مولانا شبلی کی مدد سے طے کیا تھا ۔ اس ضمن میں اقبال کے تحریر کردہ دیباچے کا حوالہ نامناسب نہ ہوگا ۔ آپ نے لکھا تھا :

''اس دیباچے میں یہ واضح کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب کسی خاص انگریزی کتاب کا ترجمہ نہیں ہے ۔ بلکہ اس کے مضامین مختلف مشہور اور مستند کتب سے اخذ کیے گئے ہیں اور بعض جگہ میں نے اپنی ذاتی رائے کا اظہار بھی کیا ہے ، مگر صرف اسی صورت میں جہاں مجھے اپنی رائے کی صحت پر پورا اعتماد تھا ۔ زبان اور طرز عبارت کے متعلق صرف اس قدر عرض کر دینا کافی ہوگا کہ میں اہل زبان نہیں ہوں ۔ جہاں تک مجھ سے

۱۸- ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ، ''اقبال اورینٹل کالج میں''— از ''مطالعہ اقبال'' مرتبہ گوہر نوشاہی ، ص ۵۵ ۔

۱۹- ڈاکٹر محی الدین قادری زور ، ''شاد اقبال'' ، ص ۴۵ ۔

ممکن ہوا ہے میں نے اقتصادی اصولوں کے حقیقی مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے جو انگریزی علمی کتابوں میں عام ہے۔ نئی علمی اصطلاحات کے وضع کرنے کی دقت کو ہر با مذاق آدمی جانتا ہے۔ میں نے بعض اصطلاحات خود وضع کی ہیں اور بعض مصر کے عربی اخباروں سے لی ہیں جو زمانۂ حال کی عربی زبان میں آج کل متداول ہیں۔ جہاں جہاں کسی اُردو لفظ کو اپنی طرف سے کوئی نیا مفہوم دیا ہے ، ساتھ ہی اس کی تصریح بھی کر دی ہے۔''۲۰

آخر میں اقبال نے اپنے بزرگوں اور دوستوں کا شکریہ ادا کیا ہے اور اس کی تصریح کی ہے کہ انھوں نے کن کتب خانوں سے استفادہ کیا تھا :

''اس دیباچے کو ختم کرنے سے پیشتر میں استاذی المعظم حضرت قبلہ آرنلڈ صاحب ، پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور ، کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے مجھے اس کتاب کے لکھنے کی تحریک کی اور جن کے فیضان صحبت کا نتیجہ یہ اوراق ہیں۔ میں استاذی جناب قبلہ لالہ جیا رام صاحب ، ایم۔ اے۔ پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور ، اور اپنے عزیز دوست اور ہم جماعت مسٹر فضل حسین بی۔ اے۔ کیمبرج بیرسٹر ایٹ لا کا بھی مشکور ہوں جنھوں نے مجھے نہ صرف اپنے بیش قیمت کتب خانوں کی کتابیں ہی عنایت فرمائیں بلکہ بعض مسائل کے متعلق نہایت قابل قدر مشورات بھی دیے۔ اس کے علاوہ مخدوم و مکرم جناب قبلہ مولانا شبلی نعمانی مدظلہ' بھی میرے شکریہ کے مستحق ہیں کہ اُنھوں نے اس کتاب کے بعض حصوں میں زبان کے متعلق قابل قدر اصلاح دی۔''۲۱

جہاں تک مواد کا تعلق ہے یہ کسی ایک کتاب کا ترجمہ نہیں بلکہ اس میں اس دور کے مقبول و متداول نظریات آ گئے تھے۔ آپ نے الفریڈ مارشل (Alfred Marshal) ، واکر (Walker) ، ایڈم اسمتھ (Adam Smith) اور جے۔ ایس۔ مل (J. S. Mill) کی تصانیف سے استفادہ کیا تھا۔ مالتھس (Malthus) اور پروفیسر ٹاوسگ (Taussig) کے نظریات سے بھی آپ متاثر نظر آتے ہیں۔ یہ امر حیرت ناک ہے کہ آپ نے حوالوں کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔ اس کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ ایک درسی کتاب میں بھاری بھر کم ناموں کے حوالے دینا ضروری نہیں تھا۔ اقبال اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوئے ہیں کہ اُنھوں نے حد درجہ سلیس اور معیاری زبان میں نفس مضمون پیش کیا تھا اور جابجا آپ نے ملک کی عام اقتصادی حالت سدھارنے اور غربت دور کرنے پر زور دیا

۲۰- شیخ محمد اقبال ، ''علم الاقتصاد'' (اقبال اکادمی ، کراچی ۱۹۶۱) ، ص ۲۵ -

۲۱- ایضاً ، ص ۲۶ -

تھا ۔ بیسویں صدی کی ابتدا سے ہندوستان میں بڑھتی ہوئی آبادی بے شمار مسائل پیدا کر رہی تھی ۔ اس دور میں تحدید نسل کا نظریہ نہ صرف درست بلکہ انقلابی معلوم ہوتا تھا ۔

اسراف بیجا بھی ہندوستان کی غربت کا بڑا سبب ہے جس کی بنا پر ہندوستان کے غریب عوام مہاجنوں اور محدود مراعت یافتہ طبقے کے ظلم و ستم میں جکڑے ہوئے تھے ۔ ان حالات میں سادگی اور کفایت شعاری پر زور وقت کی اہم ضرورت تھا ۔

انگریزی اصطلاحات کا ترجمہ بھی ایک مشکل مرحلہ تھا ، لیکن اقبال نے اس مسئلے کو بھی بخیر و خوبی حل کیا ۔ بعض اصطلاحات تو اب بھی جوں کی توں استعمال کی جا سکتی ہیں ۔ اصطلاح سازی میں آپ نے اپنے پیشروؤں سے استفادہ کیا تھا ۔ بالخصوص مولوی ذکاء اللہ کی وضع کردہ اصطلاحیں آپ نے جابجا استعمال کی تھیں ۔

آپ نے ہندوستان کی غربت دور کرنے کے لیے زور دیا تھا کہ یہاں بھی مشینیں لگائی جائیں اور جدید ترقیات سے فائدہ اٹھایا جائے تاکہ ہندوستان محض خام مال کی منڈی نہ بنا رہے ، بلکہ اعلیٰ درجے کی معیاری اشیا خود پیدا کرے ۔ اس طرح ہندوستان زرعی دور سے نکل کر مشینی دور میں داخل ہو جاتا ۔

ہماری مطبوعات

۱- اقبالیات کا تنقیدی جائزہ از قاضی اختر جونا گڑھی	۵٫۵۰ روپے
۲- اقبال اور عطیہ بیگم ، از ضیاءالدین برنی	۴٫۵۰ "
۳- مکتوبات اقبال از سید نذیر نیازی	۵٫۵۰ "
۴- اقبال اور جمالیات از نصیر احمد ناصر	۱۲٫۰۰ "
۵- صحیح فلسفۂ تاریخ کیا ہے ؟ از محمد رفیع الدین	۲٫۵۰ "
۶- اسلام اور سائنس از محمد رفیع الدین	۰٫۵۰ "
۷- اتقان العرفان فی ماہیۃ الزمان از محمود احمد برکاتی	۳٫۰۰ "
۸- مکاتیب اقبال بنام گرامی از عبداللہ قریشی	۱۲٫۰۰ "
۹- فصل المقال ، ترجمہ از عبیداللہ قدسی	۵٫۰۰ "
۱۰- سلسلۂ درسیات اقبال — پہلی کتاب از عبدالرشید فاضل	۳٫۵۰ "
۱۱- ایضاً — دوسری کتاب ایضاً	۴٫۵۰ "
۱۲- ایضاً — تیسری کتاب ایضاً	۵٫۰۰ "
۱۳- اقبال کے حضور از سید نذیر نیازی	۲۵٫۰۰ "

زیر طبع

۱- اقبال ، شخصیت اور شاعری از رشید احمد صدیقی

۲- جاوید نامہ ، اُردو ترجمہ از رفیق خاور

۳- اسرار خودی ، اُردو ترجمہ از عبدالرشید فاضل

۴- رموز بے خودی ، اُردو ترجمہ از کوکب شادانی

اقبال اکادمی پاکستان

۹۰/بی - ۲ ، گلبرگ ۳ ، لاہور

IQBAL REVIEW

Journal of the Iqbal Academy Pakistan

This Journal is devoted to research studies on the life, poetry and thought of Iqbal and on those branches of learning in which he was interested : Islamic Studies, Philosophy, History, Sociology, Comparative Religion, Literature, Art, and Archaeology.

Published alternately

in

English and Urdu

Subscription

(for four issues)

Pakistan	Foreign countries
Rs. 15.00	US $ 5.00 or £ Stg. 1.75
Price per copy	
Rs. 4.00	US $ 1.50 or £ Stg. 0.50

All contributions should be addressed to the Secretary, *Iqbal Review*, 43-6/D, Block No. 6, P.E.C.H. Society, Karachi—29. Each article must have its duplicate copy. The Academy is not responsible for the loss of any article.

Published by

Dr. M. Moizuddin, Secretary of the Editorial Board of the *Iqbal Review* and Director, Iqbal Academy Pakistan, Karachi.

Printed at

TECHNICAL PRINTERS
Koocha Haji Usmani, Off. I.I. Chundrigar Road, Karachi

IQBAL REVIEW

Journal of the Iqbal Academy Pakistan

January 1976

IN THIS ISSUE

IQBAL ACADEMY PAKISTAN
KARACHI